ISSN 0974-7346

جنوری ۲۰۲۶ء

جلد۲۱۳ —— عدد ۱

معارف

مجلس دارالمصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY

AZAMGARH

سالانہ زر تعاون

ہندوستان میں	:	سالانہ ۴۰۰/روپے۔ فی شمارہ ۴۰/روپے رجسٹرڈ ڈاک ۱۰۰۰/روپے
		ہندوستان میں ۵ سال کی خریداری صرف ۱۸۰۰/روپے میں دستیاب ہے۔
		ہندوستان میں لائف ممبرشپ ۱۰۰۰۰/روپے ہے۔
دیگر ممالک میں	:	سادہ ڈاک ۱۷۳۰/روپے۔ رجسٹرڈ ڈاک ۱۸۵۰/روپے

اشتراک پی ڈی ایف بذریعہ ای میل (ساری دنیا میں) ۴۰۰/روپے سالانہ

ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ڈاک کا سلسلہ بند ہے۔ اس لئے فی الحال پاکستان معارف کی ترسیل موقوف ہے۔

سالانہ چندہ کی رقم بینک ٹرانسفر، منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔

بینک ٹرانسفر کرکے ہم کو ضرور اطلاع دیں۔ بینک اکاؤنٹ کی تفصیلات یہ ہیں:

Account Name: DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY
Bank Name: Punjab National Bank - Heerapatti, Azamgarh
Account No: 4761005500000051 - IFSC : PUNB0476100

بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں:

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY

● زر تعاون ختم ہونے پر تین ماہ کے بعد رسالہ بند کردیا جائے گا۔ ● معارف کا زر تعاون وقت مقررہ پر روانہ فرمائیں۔ ● خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔ ● معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔ ● کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کے تصنیفی اور نشریاتی کام میں مدد کے لیے اس اکاؤنٹ پر تعاون کریں:

بینک کا نام: Punjab National Bank
اکاؤنٹ نمبر: 4761005500000051
آئی ایف ایس سی: PUNB0476100
تعاون بھیجنے کے بعد تفصیلات سے ہم کو اس ایمیل پر مطلع کریں:
info@shibliacademy.org

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی CSR کے تحت رجسٹرڈ ہے۔ اب بڑی تجارتی کمپنیاں براہ راست دارالمصنّفین کو CSR کے تحت عطیات دے سکتی ہیں۔

نوٹ: غیر ممالک سے تعاون بھیجنے کے لیے بینک کی تفصیلات ایمیل بھیج کر حاصل کریں۔

Ma'arif Section: 06386324437
Email: info@shibliacademy.org website: www.shibliacademy.org

ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی (ڈپٹی ڈائرکٹر) نے معارف پریس میں چھپوا کر دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۲۱۳ ماہ رجب المرجب ۱۴۴۷ھ مطابق ماہ جنوری ۲۰۲۶ء عدد ۱

فہرست مضامین

شذرات	محمد عمیر الصدیق ندوی	۴
مقالات		
صحابیاتؓ کا فن مرثیہ میں کردار-ایک جائزہ	ڈاکٹر محمود حافظ عبد الرب مرزا	۷
شجرکاری کی اہمیت قرآن و حدیث کی روشنی میں	ڈاکٹر ابو تمیم	۱۶
مسلمان خاتون کے حوالے سے اردو زبان کی چند اہم تصانیف: ایک جائزہ	ڈاکٹر افروز احمد بساطی، ارشید احمد شیخ	۲۶
بیسویں صدی کے اردو سفرناموں کا مطالعہ	سراج انور محمد میران	۴۰
مابعد جدیدیت اور اردو ادب کا جدلیاتی رویہ	ڈاکٹر الطاف انجم	۵۴
ملی مسائل		
حفظ قرآن کے بارے میں اسرار عالم کے اشکالات	ڈاکٹر ظفر الاسلام خان	۶۰
اخبار علمیہ	ڈاکٹر ظفر الاسلام خان	۶۵
تبصرۂ کتب	ظ۔ا۔خ، ع۔ص، ک۔ص اصلاحی، ف۔اصلاحی	۶۶
ادبیات		۷۷
(ہم نے مدینہ دیکھا، ملتِ خوردونوش)	ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی، پروفیسر اخلاق آہن	
باب الاستفسار والجواب	مسرور احمد / ظفر الاسلام خان	۷۹
معارف کی ڈاک	شاہ ظفر الیقین	۸۱
رسید کتب موصولہ		۸۲

مجلس ادارت

مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی
پروفیسر شریف حسین قاسمی
پروفیسر اشتیاق احمد ظلی
ڈاکٹر محمد اجمل اصلاحی
ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

مرتبہ

ڈاکٹر ظفر الاسلام خان
محمد عمیر الصدیق ندوی
کلیم صفات اصلاحی

ادارتی سکریٹری:

ڈاکٹر کمال اختر

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱
info@shibliacademy.org

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شذرات

الحمدللہ معارف کے اس جنوری کے شمارے سے اس کی ۲۱۳ ویں جلد کا آغاز ہوتا ہے۔ اعداد کچھ اور زیادہ ہوتے لیکن ۲۰۲۲ء سے اس کی جلدیں ششماہی کی جگہ سالانہ کی شناخت میں بدل گئیں۔ کسی بھی رسالہ اور خاص طور پر ایک اردو رسالہ کی دوسو سے زیادہ جلدوں کے سلسلہ کا سالانہ وماہانہ استمرار، وقت کی پابندی اور نہایت سخت اور مشکل ترین حالات میں بھی تاخیر اور ناغوں کی بدنمائی سے حفاظت یقیناً غیر معمولی خوبی یا قابل فخر امتیاز ہے اور اس کے اظہار میں خودستائی کے عیب کا شائبہ بھی نہیں دیکھا جانا چاہیے۔ یہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم ہے اور یہ معارف کے بانیوں اور اس کے خدمت گزاروں کے اخلاص نیت کا حسن قبول ہے۔ معارف کے لیے اس کے مدیر اولین مولانا سید سلیمان ندوی کا ایک پسندیدہ شیوہ تھا اور جس کا اظہار معارف کی نئی جلد یا اس کی عمر کے نئے سال کے آغاز پر ہوتا تھا کہ وہ معارف کے سفر کی نئی منزل پر رک کر نقوش رہ گزر کی جانب نظر کرتے اور اشارہ بھی کرتے کہ ہوا کیا اور کیا ہونا چاہیے۔ سید صاحب کے علم وفکر کے پر لطف ونہایت شگفتہ اور دلآویز ادیبانہ اور انشاپردازانہ اظہار کے لیے شذرات کے علاوہ تخت سلیمانی کی جلوہ سامانی کہیں اور مشکل سے نظر آتی ہے، ان شذراتی تحریروں کے محل کی شیشہ گری ایسی ہوتی کہ عکس بھی موج حسن انگیز میں بدل جاتا۔ معارف کی عمر کے مدارج کو وہ معارج کی شکل میں دیکھتے اور پھر عجب عجب توقعات بلکہ نکات سامنے آجاتے۔ معارف نے عمر کے ابھی صرف چھ سال پورے کیے تھے۔ اس چھ سال کی مختصر سی زندگی کو بھی انہوں نے اس لیے غنیمت سمجھا کہ یہ سست اور غیر مستقل ہندوستانیوں کا معاملہ ہے۔ یہ کہہ کر ان کو انگریزی کے ایک ہفتہ وار رسالہ سٹرڈے پوسٹ کی یاد آئی بلکہ انہوں نے اس کی یاد دلائی کہ ۱۹۲۰ میں اس کی عمر ۱۹۳ برس کی تھی۔ سید صاحب نے اس کو یکے از عجائب عالم قرار دیا۔ معارف نے نویں سال میں قدم رکھا تو سید صاحب نے پھر اس کی سالگرہ یہ کہہ کر منائی کہ اردو کے شہرستان کی اس وقت جو آب وہوا ہے اس میں نو برس کی یکساں زندگی بھی کچھ کم حیرت زا نہیں۔ ۱۹۲۴ کے اردو شہرستان کی فضا کا اب کوئی کیا اندازہ لگا سکتا ہے۔ سید صاحب نے لکھا کہ تہذیب الاخلاق مرحوم نے کل ملا کر سات برس سے بھی کم کی زندگی پائی۔ الندوہ جوں توں آٹھ برس چلا۔ ایک صدی قبل کے شہرستان اردو

کا آج کے عالم سے کیا موازنہ ؟ اس وقت سید صاحب کے دل سے دعا نکلی کہ علم و فن کا یہ بے عمل واعظ کچھ دن اور جیتا رہے۔ دل کے گہرے جذبوں میں ڈوبی اس دعا پر آمین کہنے والوں کے حاشیۂ خیال میں بھی شاید نہ آیا ہو کہ "کچھ دن" اللہ کے نزدیک ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے شمار کے لیے خمسین الفہ سنہ جیسی تعبیریں موجود ہیں۔ ۱۹۳۷ آتے آتے معارف کے عنفوان شباب کا دور شروع ہوا۔ سید صاحب نہال کیوں نہ ہوتے ؟ شکر کے الفاظ اس قسم کی تحریر کا حصہ بن گئے کہ "ہندوستان کی ناموافق آب و ہوا میں جہاں ہر سال سینکڑوں رسالے پیدا ہوتے اور مرتے ہیں معارف جیسے بے لطف رسالے کا اتنے دنوں جی جانا بڑی کامیابی ہے"۔ بے لطف رسالہ کی نشتریت گہری ہوئی تو طنز کا رنگ اور گہرا ہو گیا ۔ لکھا کہ لوگ شعر و سخن کے چٹخارے ادب لطیف کے آب و نمک اور بے معنی عبارت آرائی کے خوگر ہو گئے ہیں۔ اس حال میں اگر کچھ ایسے قدرداں بھی ہوں جو معارف کے دستر خوان کے روکھے پھیکے کھانوں کو پسند کر لیں تو یہ اس کے مہمانوں کا حسن اخلاق ہے۔ تین سال بعد یعنی ۱۹۴۰ میں معارف کا چوبیسواں پورا ہوا تو سید صاحب نے پھر لکھا کہ ۲۴ برسوں میں خدا جانے کتنے کاغذ کے پتلے، رسالوں کی صورت میں عرصۂ وجود پر آئے اور فنا ہو گئے۔ اس حالت میں معارف کی ۲۴ برس کی ایسی زندگی جس میں ایک مہینے کے لیے بھی اس نے کوئی ارادی یا جبری تعطیل نہیں منائی، اللہ تعالیٰ کے ہزار ہزار شکریہ کی مستحق ہے۔

***

خدا جانے عالم برزخ میں اس اطلاع کی رسائی کس شکل میں ہوتی ہو کہ معارف نے صرف ۲۴ برس ہی نہیں عمر کے ۱۱۰ سال پورے کر لیے پہلے تو بیس تیس برس میں انقلابات کے طوفانوں اور سیاسیات کی آندھیوں سے بچ نکلنے پر ہی خدا کا شکر لازم تھا۔ ایک صدی کا کیا ذکر کیا جائے۔ قوم وملت اور ملک اور کل دنیا انقلابات و تغیرات کی برق رفتاری اور کل یوم فی شان کی جس طرح تصویر و تفسیر بنی ہے اس کے بیان کے لیے کوئی کہاں سے علم و فہم سلیمان لائے۔ زبان و ادب کا معیار پہلے جیسا نہ رہا۔ نہ وہ بے مثال اصحاب قلم اور نہ وہ سخن شناس قاری۔ موضوعات کا تنوع بھی جیسے محدود سے محدود تر۔ نہ وہ لوگ نہ وہ دبستانوں کی شناخت اور ذوق و مزاج کا وہ بلند ترین علمی معیار جس کا خیال علامہ شبلی کے پیش نظر ہمیشہ رہا اور ان سب پر مستزاد عصری سیاست کی زد میں مذہب و تہذیب و ثقافت کی کس مپرسی۔ ان حالات میں معارف کے بزرگوں کی یہ ادا

آج بھی دل نواز ہے کہ جس راستے کو ایک دفعہ صحیح مانا، استقامت اسی پر اس کی ترجمانی اس جملے سے بڑھ کر اور کیسے ہو سکتی ہے کہ دین کی راہ سے علم کی خدمت یا یوں کہئے کہ علم کی راہ سے دین کی خدمت ہی اصل مقصد و مقصود ہے۔ سید صاحب کے الفاظ میں اس کے سوا جو چیز معارف میں ہے اس کی حیثیت حضرت ابن عباس کی خوش گوئی (احماض) کے سوا کچھ اور نہیں۔ معارف آج وقت کے جس موڑ پر ہے وہاں اب بھی اس کے دل سے یہی آواز آتی ہے کہ جدید علوم، تازہ خیالات، نئی تحقیقات کا بہ جان و دل خیر مقدم ہے لیکن اس کے معاوضہ میں بزرگوں کا اندوختہ کھونا کسی بھی درجہ میں قابل قبول نہیں۔ معارف کا اصل اور اول و آخر مقصد قرآن مجید اور اس کے علوم سے تعلق و تمسک ہے۔ عقلی، ادبی، تاریخی، تمدنی اور اخلاقی علوم وفنون کا سرچشمہ اگر قرآن نہیں تو معارف کا وجود بے معنی ہے۔ سو سال سے زیادہ کے عرصہ میں معارف نے اپنی زندگی سے یہی پیغام دیا۔ پیغام سے زیادہ دنیائے علم کو یہ احساس دیا کہ معارف کی روشنی سے تسلی کی آنکھیں روشن ہو جاتی ہیں کہ ظلمت کدۂ عالم میں کوئی تو چراغ ہے۔ ورنہ معارف کے بغیر سناٹے کا احساس تو برسوں پہلے محمد علی جوہر جیسے ہنگامہ آسا شخصیت کو ستاتا تھا۔ دعا یہی ہونی چاہیے کہ قرآن مجید کی ابدی حفاظت کے وعدہ کے طفیل میں قرآنی علوم کی خدمت کو اپنا ہدف اولین و آخرین بنانے والے معارف کی زندگی بھی پائندہ وتابندہ تر ہوتی رہے۔

***

چند دنوں پہلے یہ افسوسناک خبر آئی کہ دنیا کی موجودہ بزم صوفیہ، اپنے ایک رکن رکین سے محروم ہو گئی۔ شاہ ذوالفقار احمد نقشبندی صرف برصغیر کے جہان تصوف ہی نہیں بلکہ بزم عالم کی روشنی و درخشانی کی علامت بن گئے تھے۔ تصوف اور اہل علم کے درمیان مفروضہ فرق و فاصلہ کو انہوں نے جس طرح قبول و قربت میں بدلا اس کا اعتراف کیا جانا چاہیے۔ وہ مکتب و ملا کے فیضان نظر کا نتیجہ نہیں تھے۔ بنیاد عصری تعلیم ہی تھی مگر ایک بزرگ سید زوار حسین شاہ نے خدا جانے مکتوبات مجدد الف ثانیؒ کے مقامات کے اسرار ان پر کس طرح عیاں کئے کہ وہ خود ہی مقام مجددیت کی علامت بن گئے۔ اتباع سنت اور فکر امت یہی ان کا سرمایہ بنا اور شاید غیر معمولی مقبولیت کا سبب بھی۔ رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ

***

مقالات

صحابیاتؓ کا فن مرثیہ میں کردار-ایک جائزہ

ڈاکٹر محمود حافظ عبد الرب مرزا
شعبۂ عربی وفارسی، الہ آباد یونیورسٹی
mmjamaliindia@gmail.com

اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے عربوں کو فصاحت و بلاغت کا ایک خاص جوہر عطا فرمایا ہے۔ چونکہ زبان نہ صرف افکار و خیالات کے اظہار کا ذریعہ ہے بلکہ جذبات واحساسات کی ترجمان اور معانی ومفاہیم کی ترسیل کا مؤثر وسیلہ بھی ہے، اس لیے یہ کہنا بجا ہو گا کہ زبان نے عربوں کی تہذیبی بیداری، فکری بالیدگی اور ادبی شخصیت کی تشکیل میں ایک گہرا اثر چھوڑا ہے۔ عرب عہد قدیم ہی سے اس نعمت خداوندی پر فخر کرتے چلے آئے ہیں اور انہوں نے متعدد ادبی فنون میں نمایاں مہارت حاصل کی ہے، خصوصاً شعر گوئی میں۔ انہوں نے مختلف موضوعات پر دلآویز اشعار کہے، جن میں سے بعض اس قدر اعلیٰ پائے کے تھے کہ ان کو آب زر سے لکھ کر خانۂ کعبہ کی دیواروں پر آویزاں کر دیا جاتا تھا تاکہ وہ ان کے جذبات واقدار کی آئینہ داری کرتے رہیں[1]۔

عہد اسلامی میں بھی عربوں کے دلوں میں شعری ذوق، فصاحت و بلاغت کا جو فطری جذبہ موجود تھا، وہ پوری توانائی کے ساتھ زندہ رہا۔ دینِ اسلام نے اگرچہ بعض غیر اخلاقی مضامین پر مبنی شاعری کی حوصلہ شکنی کی، مگر اعلیٰ اخلاق، صدق، حکمت اور انسانی اقدار سے مزین شاعری کو خوب سراہا۔ خود رسولِ اکرم ﷺ عمدہ اور بامقصد شاعری سن کر خوش ہوتے، اور اس کی تعریف و تحسین فرمایا کرتے۔ چنانچہ آپ ﷺ کا یہ ارشاد گرامی ہے: "إن من الشعر لحكمة"[2] (بے شک، بعض اشعار مبنی بر حکمت ہوتے ہیں)۔

یہ امر نہایت قابلِ توجہ ہے کہ صحابیاتؓ نے بھی شعر وسخن کے میدان میں نمایاں اور قابلِ قدر

---

[1] اسد، د. ناصر الدین، مصادر الشعر الجاهلي وقيمتها التاريخية، ط ۷، دار الجیل، بیروت، ۱۹۸۸ء، ص ۱۶۹۔
[2] قیروانی، ابن رشیق، العمدة في محاسن الشعر وآدابه، تحقیق: محمد محی الدین عبد الحمید، دار الجیل للنشر والتوزیع والطباعہ، دمشق، ط ۵، ۱۹۸۱ء، ص ۲۷۔

کردار ادا کیا ہے۔ ان کے اندر نہ صرف شعری ذوق پروان چڑھا بلکہ فکری گہرائی اور ادبی پختگی بھی نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ ان کے اشعار محض جذبات کا اظہار نہیں بلکہ حکمت، بصیرت اور اسلامی اقدار کی ترجمانی کا ایک مؤثر وسیلہ تھے۔ فصاحت وبلاغت، اثر انگیزی اور فنی تخلیق کے اعتبار سے صحابیاتؓ کسی طور پر اپنے معاصر شعراء سے کمتر نہیں تھیں۔ ان کے اشعار میں احساس کی سچائی، اسلوب کی دلکشی اور فکر کی سنجیدگی اپنی پوری شان کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ چند نمایاں نام، جنہیں بطورِ مثال پیش کیا جاسکتا ہے۔ اگرچہ اس سلسلے کی فہرست خاصی طویل ہے۔ درج ذیل ہیں:

حضرت صفیہ بنت عبد المطلب، حضرت اروىٰ بنت عبد المطلب، حضرت خنساء، حضرت رقیہ بنت صیفی، حضرت سعدیٰ العبشمیہ، حضرت شیماء بنت الحارث، حضرت عاتکہ بنت زید، حضرت قتیلہ بنت نضر رضی اللہ عنہن اجمعین۔

بلاشبہ عربی ادب مراثی کے ایک عظیم، وقیع اور گراں قدر ذخیرے سے مالا مال ہے، جس میں دل کے درد، جذبات کی شدت اور انسانی احساسات کی سچائی اور صداقت نہایت مؤثر انداز میں نمایاں ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فن مرثیہ کو عربی شاعری کے اعلیٰ ترین اصناف میں شمار کیا جاتا ہے۔

ایک موقع پر جب ایک بدوی سے دریافت کیا گیا کہ 'تمہاری بہترین شاعری مرثیے ہی کیوں ہوتے ہیں؟' تو اس نے نہایت سادہ مگر دل نشین انداز میں جواب دیا: "اس لیے کہ ہم یہ اشعار اُس وقت کہتے ہیں جب ہمارا دل جل رہا ہوتا ہے"[۳]۔ یعنی مرثیہ اس کیفیتِ غم کا ترجمان ہوتا ہے جب دل صدمے سے پگھل رہا ہو اور جذبات اپنی شدت کی انتہا پر ہوں۔ یہی سوز مراثی کو غیر معمولی اثر اور گہرائی عطا کرتا ہے۔

جہاں تک خواتین کے فنِ مرثیہ گوئی میں کردار کا تعلق ہے، تو اس بات پر اہلِ تحقیق کا عمومی اتفاق ہے کہ خواتین نے اس صنفِ سخن میں نہ صرف مہارت کا ثبوت دیا بلکہ اپنی وجدانی قوت، گہرے احساسات اور فطری رقّتِ قلبی کے ذریعے عربی شاعری کے دیوانوں کو بے مثال اور گراں قدر اضافوں سے آراستہ کیا۔ اس کی ایک اہم وجہ عورت کی فطرت ہے جو مرد کے مقابلے میں زیادہ جذباتی، درد آشنا اور شفقت آمیز ہوتی ہے۔ وہ غم، ہمدردی اور رنج والم کی کیفیتوں میں زیادہ دیر تک رہ سکتی ہے، جب کہ مرد پر صبر وضبط، معاشرتی وضع داری، اور روایتی سختی کا غلبہ رہا ہے، جو اس کے جذباتِ غم کی ترجمانی کے راستے میں سدّ راہ بن جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عربی

---

[۳] تبریزی، شرح دیوان الحماسہ، تحقیق: محمد محی الدین عبد الحمید، مطبعہ حجازی، قاہرہ، ۱۹۳۸ء، ج ۲، ص ۵۲۔

شاعری میں ہمیں خواتین کے مراثی میں جہاں شدتِ جذبات، صداقتِ احساس اور سوز و گداز کی کیفیتیں زیادہ نمایاں نظر آتی ہیں، وہیں مرد شعراء کے مراثی اکثر ایک مخصوص تہذیبی دائرے میں مقید دکھائی دیتے ہیں۔ اس فرق کی ایک جھلک ہمیں عہدِ اموی کے نامور شاعر جریر کے اس دل گداز شعر میں ملتی ہے، جو اُس نے اپنی بیوی کے مرثیے میں کہا:(۴)

لولا الحياءُ لعادني استعبارُ　　ولزرتُ قبرَكِ والحبيبُ يُزار

(اگر مجھے حیا مانع نہ ہوتی، تو میری آنکھیں بار بار چھلک پڑتیں اور میں تمہاری قبر کی زیارت کرتا کیونکہ محبوب کی زیارت کی جاتی ہے)۔

اسی طرح عمر بن معدیکرب زبیدي کہتا ہے(۵):

وإنّا لَقومٌ لا تفيض دموعُنا　　على هالكٍ وإن قُصمَ الظَهرُ

(ہمارا تعلق ایک ایسی قوم سے ہے، جو آنکھوں سے آنسو نہیں بہاتے، چاہے کسی کی موت کمر توڑ دینے والی کیوں نہ ہو)۔

یہ اشعار اس سماجی حقیقت کی عکاسی کرتے ہیں کہ عورت کی رقتِ قلب اور جذباتی اظہار نے اسے فنِ مرثیہ میں قدرتی برتری دی، جب کہ مرد تقالید کے بوجھ تلے جذبات چھپانے پر مجبور رہا۔ اسی لیے خواتین کے مراثی نہ صرف فصاحت و بلاغت کا نمونہ ہوتے، بلکہ دل سے نکلے سوز و درد کی صدا بھی ہوتے ہیں۔

زیرِ نظر مقالے میں ان منتخب صحابیاتؓ کے فنِ مرثیہ نگاری میں کردار کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے، جنہوں نے نہ صرف اپنے رنج و الم کو شعری پیرایے میں ڈھالا، بلکہ مرثیہ کو اظہارِ جذبات کا ایک بامعنی اور مؤثر وسیلہ بھی بنایا۔

حضرت صفیہؓ بنت عبد المطلب، سخن فہم اور شعر و شاعری سے شغف رکھتی تھیں، اور آپ سے کئی احادیثِ نبویہ کی روایت بھی منقول ہے۔ سیرت کی بعض کتابوں میں آپ کے وہ مرثیے منقول ہیں جو آپ نے خاتم النبیین ﷺ کی وفات پر کہے۔ انہی میں ایک پر درد مرثیہ کے اشعار یہ ہیں(۶)۔

---

(۴) دیوان جریر بشرح محمد بن حبیب، تحقیق د. نعمان محمد امین طہ، دار المعارف، قاہرہ، ط۳، ج۲، ص۱۶۔

(۵) حنفی، عبد الوهاب بن احمد بن علی، الطبقات الکبری - لواقح الأنوار في طبقات الأخيار، مکتبۃ محمد المليجي الكتبي واخيه، قاہرہ، ۱۳۱۵ھ، ص۵۸۔

(۶) مقریزی، تقي الدين، إمتاع الأسماع بما للنبي من الأحوال والأموال والحفدة والمتاع، تحقیق و تعلیق: محمد عبد الحمید نمیسی، جلد ۱۴، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۹۷۱ء، ص۵۹۹۔

لهف نفسي! وبتّ كالمسلوب آرقُ الليل فعلة المحروب

(افسوس! میرا دل غم سے نڈھال ہے، اور میں ایسی مضطرب رات گزارتی ہوں جیسے کسی نے سب کچھ چھین لیا ہو۔ میرا سونا اجڑ گیا، اور نیند مجھ سے روٹھ گئی)۔

حين قالوا: إن الرسول قد أمسى وافقتْه منيةُ المكتوب

(جب لوگوں نے کہا: رسول اللہ ﷺ ہمارے درمیان نہیں رہے، ان کا وہ وقت آن پہنچا جو ازل سے مقدر تھا)۔

فإلى الله ذاك أشكو وحسبي يعلم الله حوبتي ونحيبي

(میں یہ دکھ اللہ تعالی کے حضور پیش کرتی ہوں، وہی میرے لئے کافی ہے۔ اللہ خوب جانتا ہے میرے دل کا حال، میری گریہ وزاری اور آہ وبکا)۔

یہ اشعار نہ صرف حضرت صفیہؓ کے فطری احساسات و جذبات کی عکاسی کرتے ہیں، بلکہ ان کی شعری صلاحیت، گہرے احساس اور ادبی ذوق کا بین ثبوت بھی ہیں۔ ان کا یہ مرثیہ تاریخِ اسلامی ادب میں ایک مؤثر مثال کے طور پر یاد رکھا جاتا ہے۔

حضرت اَرویؓ بنت عبد المطلب نے بھی نبی اکرم ﷺ کی وفات کے موقع پر چند مرثیے کہے تھے۔ ان اشعار میں نہ صرف آپؐ کی ذاتِ اقدس سے گہری عقیدت اور رشتہ داری کا درد جھلکتا ہے، بلکہ وہ غم و اندوہ کی کیفیت اور رقتِ قلبی کی بہترین عکاسی بھی کرتے ہیں۔ یہ مرثیہ ادبِ اسلامی میں ابتدائی مراثی کی ایک نادر مثال کے طور پر خاص اہمیت رکھتا ہے:[۷]

ألا يا رسولَ الله كنتَ رجاءنا وكنتَ بنا بَرًّا ولم تك جافِيًا

(اے رسول اللہؐ! آپ ہی تو ہماری امید تھے، آپ ہمیشہ ہم پر مہربان رہے، کبھی بے رخی نہ کی)۔

وكنتَ بنا رؤوفاً رحيماً نبينا ليبكِ عليك اليوم من كان باكيًا

(آپ ہمارے نبی ہیں، نہایت شفیق اور رحم دل، آج جو کوئی بھی رونے والا ہے، وہ آپ پر اشک بہائے)۔

فدى لرسول الله أمّي وخالتي وعمي ونفسي قصرة ثم خاليًا

(میری ماں، میری خالہ، میرے چچا، حتیٰ کہ میری جان بھی، رسول اللہؐ پر قربان ہو، خواہ میں سب کچھ کھو بیٹھوں)۔

فلو أن ربَّ الناس أبقاك بيننا سعدنا ولكن أمره كان ماضيًا

(کاش کہ اللہ تعالی نے آپ کو ہمارے درمیان باقی رکھا ہوتا، تو ہم خوش رہتے، مگر اس کا فیصلہ

---

[۷] ماخذ سابق، ص ۵۹۷۔

نافذ ہو چکا ہے)۔

عليك من الله السلامُ تحيةً وأُدخلت جناتٍ من العدن راضيًا

(آپ کو اللہ کی طرف سے سلامتی ہو، اور آپ کو عدن کے باغات میں راضی وخوش داخل کیا گیا ہو)۔

حضرت اَرویٰؓ کے یہ اشعار نہ صرف ان کے قلبی جذبات کی عکاسی کرتے ہیں بلکہ رسولِ اکرم ﷺ سے ان کی بے پایاں محبت، عقیدت اور روحانی وابستگی کا بھی گہرا اظہار ہیں۔ یہ مرثیہ عربی مرثیہ گوئی کی ایک درخشاں مثال کے طور پر سامنے آتا ہے، جس میں فصاحت وبلاغت کے ساتھ ساتھ وفا، سوزِ دروں، دردِ محبت اور ایمان کی روشنی یکجا ہو گئی ہے۔ اس مرثیے میں زبان وبیان کی لطافت کے ساتھ اخلاص اور روحانی تاثیر کا وہ امتزاج موجود ہے جو اسے ادبِ اسلامی کے ابتدائی نقوش میں ممتاز مقام عطا کرتا ہے۔

حضرت قتیلہ بنت نضر بن حارث نے جب اپنے والد کے قتل کے حکم کی خبر سنی، تو دل کے زخموں سے اُبلتے ہوئے جذبات کو نظم کی صورت میں پیش کیا۔ ان کے اشعار میں نہ صرف ایک بیٹی کا کرب بولتا ہے بلکہ فصاحت، بلاغت، سوز، درد، اور رحم و عاطفت کی اپیل اپنے عروج پر دکھائی دیتی ہے۔ انھوں نے نہایت پر اثر انداز میں اپنے والد کے حق میں نرمی، عفو، اور مہربانی کی التجا کی۔ ان کے یہ اشعار جب سننے والوں کی سماعت سے ٹکراتے، تو دلوں کو ہلا دیتے اور آنکھوں کو اشک بار کر دیتے:

هل يسمعن النضر إن ناديته هل كيف يسمع ميت لا ينطق

(کیا (میرے والد) نضر مجھے سن پائیں گے اگر میں انہیں پکاروں؟ مگر کیسے؟ وہ تو خاموش، مردہ ہیں، بولنے کی طاقت نہیں رکھتے!)۔

قسراً يقاد إلى المدينة متعباً رسف المقيد وهو عان موثق

(زبردستی تھکے ہارے انہیں مدینہ لایا گیا، پابہ زنجیر، مضبوطی سے بندھے ہوئے!)۔

أمُحَمَّد ولدتك خير نجيبة من قومها والفحل فحل معرق

(اے محمد! آپ کو ایک خاتون نے جنا، جو اپنے قبیلے میں سب سے بہتر تھیں، اور ان کا شوہر بھی نجیب النسب تھا)۔

ما كان ضرك لو مننت و ربما منّ الفتى وهو المغيظ المحنَق

(اگر آپ ان پر مہربانی فرماتے، تو آپ کا کیا نقصان ہوتا؟ بسا اوقات جلال وغصے کے عالم میں بھی

معاف کر دینا ہی سب سے بڑی عظمت ہوتی ہے)۔

فالنضر أقرب من أسرّت قرابة وأحقهم إن كان عتق يُعتَقُ

(نضر ان سب میں آپ کا قریبی تھا جنہیں آپ نے گرفتار کرنے کا حکم دیا، اگر کسی کو معاف کیا جانا تھا، تو وہ سب سے زیادہ اس کا مستحق تھا!)۔

ان اشعار کی تاثیر اتنی شدید تھی کہ جب یہ پر اثر مرثیہ رسولِ اکرم ﷺ کی بارگاہ میں پہنچا، تو آپ کی آنکھیں پر نم ہو گئیں، اور آپ ﷺ نے انتہائی رقت آمیز انداز میں فرمایا: ''اگر یہ اشعار میرے علم میں پہلے آ گئے ہوتے تو میں نضر کے قتل کا حکم نہ دیتا''۔ یہ واقعہ نہ صرف شاعری کی اثر انگیزی کا مظہر ہے بلکہ اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ عربی مرثیہ گوئی محض اظہارِ غم کا ذریعہ نہیں بلکہ تلواروں کی دھار کو بھی موم کر دینے والی تاثیر رکھتی تھی[۸]۔

حضرت خنساءؓ، جن کا اصل نام تماضر بنت عمرو تھا، عرب کی ان ممتاز شاعرات میں شمار ہوتی ہیں۔ ''خنساء'' کا لقب آپ کو اس لیے ملا کہ آپ کے ناک کے نتھنے بلند اور نمایاں تھے، جو اس وقت کے عرب معاشرے میں حسن و جمال کی علامت سمجھے جاتے تھے[۹]۔ ابتدائی دور میں حضرت خنساءؓ زیادہ تر مختصر اور جذباتی اشعار کہتی تھیں، لیکن جب ان کے بھائی صخر ایک قبائلی جھگڑے میں مارے گئے، تو ان کے کلام میں ایک گہری تبدیلی رونما ہوئی۔ بھائی کے غم میں کہے گئے ان کے مراثی نہایت دل گداز، پر اثر اور رنج و الم سے بھرپور تھے، جنہوں نے عربی مرثیہ گوئی کو ایک نئی جہت عطا کی۔ ان کی شاعری میں بھائی کی بہادری، سخاوت، اور قربت کا نقش بڑی شدت اور سچائی سے ابھرتا ہے، اور یہی مراثی ان کے شعری کمال کا نقطۂ عروج مانے جاتے ہیں۔ ذیل میں ان کے چند مشہور اشعار نقل کیے جاتے ہیں[۱۰]:

ألا لا أرى في الناسِ مِثلَ مُعاوِيَه إذا طَرَقَت إحدى اللَيالي بِداهِيَه

(میں نے لوگوں میں معاویہ جیسا کوئی نہیں دیکھا، جب کوئی مصیبت کی رات اچانک آتی، تو وہی سب سے بڑھ کر اس کا سامنا کرتا تھا)۔

---

[۸] عودہ، ڈاکٹر سلیمان بن حمد، المرأۃ والدعوۃ في عصر النبوۃ، جامعۃ القصیم، کرسی السیرۃ النبویہ وخدمۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم، ص ۸۱- ۸۲، بریدہ، ۲۰۱۲ء۔ ''عہد نبوی میں خواتین کا دعوتی کردار''، مترجم: محمود مرزا، اسلامک فقہ کونسل آف انڈیا، ممبئی، ۲۰۱۷ء، ص ۱۲۱- ۱۲۲۔

[۹] ہاشمی، احمد، جواهر الأدب في أدبيات وإنشاء لغة العرب، مکتبہ تجاریہ کبری، ۱۹۶۹ء، ج ۱، ص ۱۲۷- ۱۲۸۔

[۱۰] حرکاتي، میلود، التركيب اللغوي في شعر الخنساء، جامعۃ باتنۃ، الجزائر، ۲۰۰۷ء، ص ۵۔

فَأَقسَمتُ لا يَنفَكُّ دَمعي وَعَولَتي عَلَيكَ بِحُزنٍ ما دَعا اللَهَ داعِيَه

(میں نے قسم کھالی ہے کہ میرے آنسو اور نوحہ کبھی نہیں تھمیں گے، اور جب تک کوئی اللہ کو پکارنے والا باقی ہے، میں تیرے غم میں ہمیشہ اشک بہاتی رہوں گی)۔

یہ اشعار حضرت خنساءؓ کے کرب، محبت اور وفا کا جیتا جاگتا ثبوت ہیں۔ ان کی شاعری میں سوز، فصاحت، اور اثر آفرینی کا ایسا امتزاج نظر آتا ہے جو عربی ادب میں ہمیشہ کے لیے باقی رہے گا۔ بعد ازاں ان کے بھائی صخر نے دشمنوں پر حملہ کیا اور مالِ غنیمت حاصل کیا، لیکن دشمنوں نے اس کا تعاقب کیا یہاں تک کہ اُسے ایک ایسا کاری زخم لگا جس کے نتیجے میں وہ بعد میں وفات پا گیا۔ حضرت خنساءؓ اپنے دونوں بھائیوں معاویہ اور صخر کے غم میں اس قدر دل گرفتہ ہوئیں کہ مسلسل روتی اور مرثیے کہتی رہیں، یہاں تک کہ صدقِ احساس اور سوز بیان کی مثال بن گئیں۔ اسی لیے علمائے فنِ شعر کا اس بات پر اجماع ہے کہ عربوں کی تاریخ میں کوئی خاتون حضرت خنساءؓ سے بڑھ کر مرثیہ گو شاعرہ نہیں گزری۔

جب اسلام کا سورج طلوع ہوا، اور رسالتِ محمدیہ ﷺ کی دعوت پھیلنے لگی، تو اس کا اثر حضرت خنساءؓ کے ذہن و دل پر بھی گہرا پڑا۔ وہ اپنے قبیلے کے چند افراد کے ہمراہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور اسلام قبول کر لیا۔ آنحضرت ﷺ نے ان کے اشعار سنے، اور نہ صرف پسند فرمائے بلکہ ان کی حوصلہ افزائی بھی کی۔ آپ ﷺ جب ان کی شاعری سنتے تو فرماتے: "هيه يا خناس"[11]، اور ہاتھ سے اشارہ کرتے، جیسے ان کی توجہ مزید شعر کہنے کی طرف دلائی جائے۔ یہ رسولِ اکرم ﷺ کے ذوقِ جمال اور شعر کے اخلاقی استعمال کی قدر دانی کا مظہر تھا۔ حضرت خنساءؓ اسلام قبول کرنے کے بعد بھی اپنے بھائیوں، خصوصاً صخر کے غم سے کبھی بھی مکمل طور پر نجات حاصل نہ کر سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بعد کے اشعار میں بھی بھائی کی جدائی، اس کا درد، اور یادوں کی کسک جابجا محسوس ہوتی ہے، جو ان کی شاعری کو مزید مؤثر اور دل نشین بنا دیتی ہے[12]:

يُذكّرني طلوعُ الشمسِ صخراً وأذكُرُهُ لكلِّ غروبِ شمسِ

(طلوعِ آفتاب مجھے صخر کی یاد دلاتا ہے، اور ہر غروبِ آفتاب پر بھی وہ یاد آتا ہے)۔

---

[11] عودہ، ڈاکٹر سلیمان بن حمد، المرأة والدعوة في عصر النبوة، جامعة القصيم، کرسی السیرة النبویہ وخدمة الرسول صلی اللہ علیہ وسلم، ص ۸۱، بریدہ، ۲۰۱۲ء، نقلاً عن ابن حجر، الاصابة في تمييز الصحابة، ج ۱۲، ص ۲۲۶۔

[12] مبارک، علیہ مصطفی، صحابیات مجاھدات، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۲۰۰۳ء، ص ۴۴۔

أَلا يا صخرُ لن أنساكَ حتى أُفارِقَ مُهجتي ويُشَقَّ رمسي

(اے صخر! میں تمھیں کبھی نہیں بھلا سکتی، یہاں تک کہ میری روح نکل جائے اور میری قبر کھودی جائے)۔

ولولا كثرةُ الباكينَ حولي على إخوانِهم لقتلتُ نفسي

(اگر میرے اردگرد اتنے لوگ اپنے بھائیوں پر رو نہ رہے ہوتے، تو میں شاید اپنا خاتمہ کر چکی ہوتی)۔

ایک اور موقع پر وہ کہتی ہیں[13]:

أَلا يا صخرُ إن أبكيتَ عيني فقد أضحكتني زمناً طويلاً

(اے صخر! اگر تم نے آج میری آنکھوں سے آنسو نکلوائے ہیں، تو تم نے مجھے طویل عرصے تک ہنسنا بھی تو سکھایا تھا)۔

دفعتُ بكَ الجليلَ وأنتَ حيٌّ فمن ذا يدفعُ الخطبَ الجليلا

(جب تم زندہ تھے، تو میں ہر بڑی مصیبت کو تمہارے حوالے کر دیتی تھی، اب بتاؤ، تمہارے بعد ان بڑی مصیبتوں کو کون روکے گا؟)۔

إذا قَبُحَ البكاءُ على قتيلٍ رأيتُ بكاءَكَ الحَسنَ الجميلا

(جب کسی مقتول پر رونا معیوب سمجھا جاتا ہو، تب بھی تم پر بہنے والے آنسو مجھے خوبصورت ترین دکھائی دیتے ہیں)۔

حضرت خنساءؓ کی شاعری اسلام سے پہلے گہری اور مؤثر تو تھی ہی، لیکن اسلام کی آغوش میں آنے کے بعد ان کی شاعری میں روحانی شعور اور اخلاقی گہرائی کا اضافہ ہو گیا۔ ان کے اشعار میں ذاتی المیے کو ادبی کمال کے ساتھ پیش کرنے کی جو قدرت تھی، وہ عربی ادب میں بے نظیر ہے۔ ان کے اشعار صرف مرثیے نہیں، بلکہ ایک عورت کے دل کا نوحہ ہیں — ایسی عورت جو محبت، قربانی، وفا اور حزن کی علامت بن چکی ہے۔ اپنے بھائی صخر کے غم میں۔ اور یہ ان کے بہترین مراثی میں سے ایک ہے۔ حضرت خنساءؓ کہتی ہیں[14]:

أعينيّ جوداً ولا تجمُدا ألا تبكيانِ لصخر الندى؟

(اے میری دونوں آنکھو! بہو اور کبھی نہ رکو، کیا تم صخر سخاوت پر نہیں روؤ گی؟)۔

ألا تبكيان الجريءَ الجميلَ ألا تبكيان الفتى السيدا؟

---

(13) مبارک، علیہ مصطفی، صحابیات مجاهدات، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۲۰۰۳ء، ص ۴۴۔

(14) کحالہ، عمر رضا، أعلام النساء في عالمي العرب والإسلام، مؤسسۃ الرسالہ، بیروت، ۲۰۱۱ء، ج ۱، ص ۳۵۶۔

(کیا تم اس دلیر و حسین جوان پر نہیں گریہ وزاری کرو گی؟ کیا تم اس نوجوان سردار پر نہیں آنسو بہاؤ گی؟)۔

طویلَ النِجاد رفیعَ العِما د سادَ عشیرتہُ أمردا

(جو لمبے تلوار بند، بلند و قار والا تھا، اور کم عمری میں ہی اپنی قوم کا سردار بن گیا تھا)۔

إذا القوم مدوا أیادیھم إلی المجـــد مد إلیه یدا

(جب لوگ عزت و شرف کی طرف ہاتھ بڑھاتے، تو وہ بھی اپنا ہاتھ بڑھاتا)۔

مندرجہ بالا اشعار اس مایہ ناز شاعرہ کی فنی عظمت اور اس کی اس بے مثال صلاحیت کا روشن نمونہ ہے، جس کے ذریعے وہ اپنے غم واندوہ اور دل کے زخموں کو الفاظ کا جامہ پہنانا جانتی تھی۔ یہ محض چند اشعار نہیں بلکہ آنسوؤں کا ایک چشمہ ہے، جو فراق کی تپش اور غم کی شدت سے اُبلتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ الفاظ سیاہی سے نہیں بلکہ دل کے خون سے صفحۂ قرطاس پر منتقل ہو گئے ہوں، اور اس میں اس کی روح کا نچوڑ گھل گیا ہو، یہاں تک کہ بھائی کے بچھڑنے کے بعد یہ سارا جہاں اس کے لیے ویرانی میں بدل گیا ہو۔ اور یہ مرثیہ اپنی صدقِ جذبات، گہرے احساس، سادہ مگر بلیغ الفاظ اور مضبوط تراکیب کے باعث عربی مرثیہ گوئی کے بڑے بڑے نمونوں پر فوقیت حاصل کر گیا ہے۔ اس کی الفاظ کی نرمی، عبارت کی روانی اور بیان کی صفائی اس بات کی دلیل ہے کہ عورت کی فطرت میں غم کے وقت جو جذبات کا طوفان اُٹھتا ہے، وہ اکثر مرد سے زیادہ شدید اور اثر انگیز ہوتا ہے[(۱۵)]۔

یہ چند جھلکیاں تھیں صحابیاتؓ کے مراثی کی، جو ایک زندہ جاوید انسانی تجربے کی عکاسی کرتی ہیں۔ ان میں عربی خاتون کے دل کی وہ کیفیات نہایت صدق اور سچائی کے ساتھ جلوہ گر ہیں، جو کسی عزیز کے فراق میں اس کے دل پر بیتتی ہیں۔ یہ مراثی صرف اشعار ہی نہیں بلکہ ایک ایسا جذباتی نقش ہیں جو رنج والم کی شدت، اور فطری احساسات کی پاکیزگی کے ساتھ قاری کے دل پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ مراثی، ادبِ عربی کے اُن روشن نگینوں میں شمار ہوتی ہیں جنہیں نسل در نسل پڑھا، سنا اور سراہا جاتا ہے۔ ان اشعار میں بیان کی چند خصوصیات قابلِ ذکر ہیں، جن میں استفہامی اسلوب بھی شامل ہے جو بعض اوقات تصدیق واثبات کے مفہوم کو جنم دیتا ہے، اور تکرار کا انداز بھی جس سے معانی میں زور اور گہرائی پیدا ہوتی ہے، اور جس سے قاری کو شاعرہ کے کرب اور جذبات میں شریک ہونے کا موقع ملتا ہے۔

---

(۱۵) حسن فتح الباب، "مراثی الخنساء لأخویھا صخر ومعاویہ" جذور جرنل، شمارہ نمبر ۲۸، ۱ر جولائی ۲۰۰۹ء، ص ۱۴۸- ۱۴۹۔

شجر کاری کی اہمیت قرآن وحدیث کی روشنی میں

ڈاکٹر ابو تمیم

شعبۂ اسلامک تھیالوجی، عالیہ یونیورسٹی، کولکاتا

atamim@aliah.ac.in

ماحولیات و انسانیت کی تحفظ وبقاکے لئے اسلام نے کچھ ایسے بنیادی اصول عطاء کئے ہیں، جن کی مثال کہیں اور نہیں ملتی۔ اسلام نے جہاں ایک طرف انسانیت کو روحانی بالید گی عطا کی، اخلاق کو سنوارا اور تہذیب وتمدن سے روشناس کرایا، وہیں دوسری طرف معاشرے کو ہر طرح کی گندگی سے پاک وصاف رکھنے کے لئے کچھ بنیادی اصول قائم کئے۔ نیز انسان کو رہنے سہنے، اٹھنے بیٹھنے کھانے پینے، حتی کہ لباس پہننے اور قضائے حاجت کرنے کے طریقوں سے بھی آشنا کیا۔ ساتھ ہی ساتھ اسلام نے یہ اعلان کیا کہ زمین میں اس کی اصلاح کے بعد فساد مت مچاؤ![1]۔یعنی قدرت نے زمین کو جس حسن تدبیر، امن وامان، جمال وکمال سے سجایا، اس میں اپنی مذموم حرکتوں سے کسی قسم کی تبدیلی مت کرو!

قبل از اسلام عرب سماج ان گنت معاشرتی و اخلاقی برائیوں سے پُر تھا۔ جسمانی گندگی وماحولیاتی آلودگی بھی ان کی سماج کالازمی جز اور حصہ تھی۔ غیر مہذب عربوں کی قبائلی زندگی میں صفائی ستھرائی کی کوئی اہمیت نہیں تھی، وہ طہارت و نظافت سے بے خبر تھے۔ موجودہ حالات کے برعکس عرب معاشرہ جو کہ یہودیوں، بت پرستوں اور عیسائیوں کے طرزِ معاشرت پر مشتمل تھا، جسمانی صحت وماحولیاتی آلودگی کی طرف متوجہ نہ تھا۔

اسلام دین انسانیت اور دینِ فطرت ہے۔ اس لحاظ سے اللہ کا سب سے پسندیدہ دین، یعنی اسلام، محض ایمان وعقائد اور عبادات کا نام نہیں بلکہ یہ ایک منظم ومکمل جامع نظامِ حیات ہے، جس میں نہ صرف انسانی زندگی کے ہر پہلو اور ہر رخ کے لئے وقتی طور پر حکم بیان کیا گیا ہے، بلکہ

---

[1] سورہ اعراف، آیت ۵۶ ، ترجمہ: تفسیر روح القرآن، ج ۲، ص ۳۴۱، اردو ترجمہ جلالین از مفتی عزیز الرحمن عثمانی، حاشیہ وتفسیر مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی، فیصل پبلیکیشنز، دیوبند، ۲۰۰۹ء

انسانوں کے ساتھ ساتھ چرند و پرند، پیڑ، پودوں اور زمین کی تمام چیزوں کی حفاظت و اہمیت اور ان کی قدر دانی کی ابدی اور دائمی ہدایت دی گئی ہے۔ اللہ کا فرمان ہے:"لاَ تُفْسِدُواْ فِي الأَرْضِ بَعْدَ إِصْلاَحِهَا"(زمین میں اس کی اصلاح کے بعد فساد مت مچاؤ!)(۲)۔

عربی زبان میں لفظ "فساد" وسیع مفہوم کا حامل ہے۔ "المفردات" میں فساد کی تشریح کرتے ہوئے علامہ راغب اصفہانی تحریر کرتے ہیں:"فساد کا معنی کسی چیز کا اپنی حالتِ سلیمہ سے بدل کر خراب حالت میں آجانا ہے۔ اسکی ضد صلاح ہے، جیسا کہ کسی بھی چیز میں تغیر واقع ہو جانے، یا بدبو ہو جانے، یا لائقِ استعمال نہ رہنے پر بولا جاتا ہے۔ اہل عرب کہتے ہیں" قد فسد الشیء "چیز خراب ہو گئی ہے۔ پھر یہ لفظِ فساد ہر اس شئ کے لئے استعمال کیا جانے لگا جو اعتدال سے تجاوز کر جائے جیسے ظلم و تعدی وغیرہ(۳)۔

اسلامی تعلیم کا بنیادی مقصد معاشرۂ انسانی اور ماحول کی اصلاح کرنا ہے کیوں کہ ماحول کا اثر انسانی جسم اور اسکے بناوٹ، بود وباش، طرزِ زندگی اور اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ان تمام نعمتوں پر پڑتا ہے جن کا براہِ راست تعلق انسان کی حیات طیبہ سے ہے۔ درخت اللہ تعالیٰ کی ان عظیم نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے، جس کا تعلق ہماری دنیا کی وقتی زندگی کے ساتھ ساتھ آخرت کی ابدی اور دائمی زندگی سے بھی ہے، جن کو جنت کہا جاتا ہے اور جنت کے معنی باغ کے ہیں۔ لہذا قرآن وحدیث میں درختوں اور پودوں کی ضرورت و اہمیت اور اسکی قدر دانی کے متعلق متعدد جگہوں پر مختلف طریقوں سے بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد فرمایا:"أَمَّنْ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَأَنزَلَ لَكُم مِّنَ السَّمَاء مَاء فَأَنبَتْنَا بِهِ حَدَائِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ "(وہ کون ہے جس نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کیا اور تمہارے لئے آسمان سے پانی اتارا، پس ہم نے اس پانی سے تروتازہ اور خوبصورت باغ اگائے)(۴)۔

نبی صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے شجر کاری کو اتنی اہمیت دی کہ اس کو قیامت تک جاری رکھنے کی ترغیب دی۔

---

(۲) ماخذ سابق۔

(۳) راغب الاصفہانی، المفردات فی غریب القرآن، تحقیق: صفوان عدنان داؤدی، دار القلم دمشق، دار الشامیۃ بیروت ۱۴۱۲ھ – ۱۹۹۲ء، ص: ۳۹۷

(۴) سورۃ النمل، آیت ۶۰

ارشاد فرمایا: اگر قیامت کی گھڑی آجائے اور تم میں سے کسی کے ہاتھ میں کوئی پودا ہو اور اسے لگا سکے تو لگائے بغیر کھڑا نہ ہو[۵]۔ لہٰذا فضائی آلودگی کے اس دور میں ضرورت ہے کہ بڑے بڑے سیمنار، کانفرنس، ورکشاپ اور سمپوزیم کے ذریعے عوامی بیداری کی مہم چلائی جائے اور جگہ جگہ پیڑ اگا کر فضائی آلودگی کو کنٹرول کرنے کی تدابیر کی جائیں تاکہ قدرت کی حفاظت کی جاسکے۔

شجر کاری کی اہمیت: قرآن کریم نے مختلف حوالوں سے متفرق جگہوں میں پیڑ پودوں کے فوائد اور اہمیت کو ۱۴۰۰ سال پہلے ہی ذکر کیا ہے۔ درخت لگانے کے عمل کو شجر کاری یا پلانٹیشن کہا جاتا ہے۔ یہ عمل ہر دور میں تحفظ ماحولیات کے لئے اہم کردار کا حامل رہا ہے۔ ہر زمانے میں درخت لگانے اور ان کی حفاظت کی اہمیت تاریخ میں ملتی ہے۔ فراعنۂ مصر کے یہاں اس بات کا رواج تھا کہ مرنے والا اپنی قبر پر جو کتبہ تیار کراتا، اس میں اپنی نیکیوں کو درج کراتا۔ چنانچہ ان کے ایک بادشاہ نے یہ درج کرایا کہ ”میں نے درخت نہیں کاٹا، دریائے نیل کے پانی کو گندا نہیں کیا“۔

موجودہ حالات میں شجر کاری ملک کے لئے اہم ترین ضرورت بن چکی ہے۔ ملک کے مستقبل کو سنوارنے اور ماحولیات کی آلودگی سے تحفظ کے پیش نظر، شجر کاری کے حوالے سے مستقل اور دائمی اقدامات کئے جارہے ہیں۔ جب بھی ہم نے فطرت سے سرِمو انحراف کیا تو لازماً، بحروبر میں فساد برپا ہو گیا جیسا کہ ارشادِ ربانی ہے: ”ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ“ (خشکی اور تری میں فساد برپا ہو گیا انسانوں کے اپنے کرتوتوں کی وجہ سے)[۶]۔

حقیقت یہ ہے کہ ہم نے خدا کی نافرمانی کی اور درختوں کا خیال رکھنا چھوڑ دیا، بے زبانوں کے آشیانے اجاڑ دیے، ان پر بیدردی سے آرے چلاتے رہے اور فیکٹریاں بڑھاتے رہے، صورتِ حال یہاں تک پہنچی کہ آج تقریباً ڈیڑھ ارب لوگ زہر آلود فضا میں سانس لے رہے ہیں۔

فرینک کیلی ڈپٹی ڈائرکٹر MRC سینٹر برائے ماحولیات و صحت، لندن، کا کہنا ہے کہ ”ہم مجبور ہیں کہ ہمیں سانس لینا ہے لہٰذا ہم آلودگی سے بچ نہیں سکتے، اس لئے ہمیں ضرورت ہے کہ ہم اپنی طرز زندگی بدلیں اور آلودگی کو ختم کرنے کی کوشش کریں، نہ کہ ماسک پہن کر یہ پیغام

---

[۵] مسند احمد، دار القلم دمشق، ۲۰۱۳ء، حدیث ۱۲۵۱۲

[۶] سورۃ الروم، آیت ۴۱

دیں کہ ہم اس آلودہ فضامیں سانس لینے کے لئے پر عزم ہیں"[۷]۔

قدرت میں مداخلت کرنے سے فضائی توازن میں خلل پیدا ہو گا اور اس کا بلاواسطہ اثر سب سے پہلے انسانوں پر پڑے گا، اس کے بعد دوسرے جانداروں پر، کیونکہ قدرت کی دو اہم نعمتیں پانی اور ہوا ہیں، ان دونوں کے آلودہ ہونے سے دوسرے جانور کچھ دن بغیر پانی کے بچ جائیں گے، مگر انسان سب سے پہلے مرے گا۔ اسی طرح اگر آکسیجن بند کر دی جائے تو وہ جانور جو مٹی یا پانی کے اندر رہتے ہیں وہ کچھ وقت تو گزارا کر لیں گے، مگر سب سے پہلے انسان اس دنیا کو الوداع کہے گا۔ مگر افسوس ہے کہ انسان اپنی خود غرضی اور ہوس پرستی کی تلوار سے جنگلات کو کاٹ کر جس طرح ہمارے قومی خزانہ کو نا قابلِ تلافی نقصان پہنچا رہا ہے، اسی طرح فضائی آلودگی بھی اپنے پیر پھیلا رہی ہے۔

ہمیں اپنے گھروں اور دفتروں کے اندر پودوں کے گملے رکھنے چاہئے، کیوں کہ تحقیق کے مطابق چھوٹے چھوٹے پودوں کے گلدستے گھروں میں رکھنے سے گھر کی فضائی آلودگی صاف ہوتی ہے۔ محققین کی رائے یہ ہے کہ ایسی آلودگی سے بچنے کے لئے کمروں میں ۸ سے ۱۰ پودے ہونے چاہئیں۔ WHO نے صحت عامہ کے لئے فضائی آلودگی کو سب سے بڑا خطرہ قرار دیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ چین اور بھارت کے لئے فضائی آلودگی سب سے اہم مسئلہ ہے، جہاں صنعت کاری کی دھوم مچی ہوئی ہے۔ ایک تحقیق کے مطابق صرف سنہ ۲۰۱۲ء میں فضائی آلودگی سے مرنے والوں کی تعداد ۷۰ ہزار تھی[۸]۔

درخت کے فوائد: نباتات اور ماحولیات کے ماہرین کے مطابق آلودگی سے تحفظ کے متعدد اسباب و ذرائع میں ایک اہم ذریعہ درخت اور گھنے جنگلات ہیں۔ قدرت کا عجیب نظام ہے کہ اس کائنات میں جہاں ماحول کو گندہ کرنے کے لیئے بیشمار غیر قدرتی وسائل پائے جاتے ہیں، وہیں مالک کائنات نے ماحولیات کو صاف کرنے اور اس میں موجود کثافت کو جذب کرنے والے ان گنت ذرائع بھی پیدا کئے ہیں:

---

(۷) Ross Lydall, "London's toxic air crisis," Evening Standard,2019

(۸) The Guardian (UK), 12 February 2016.

۱. شجر کاری ہندوستان کی موجودہ بے روزگاری کے زمانے میں ماحول کے ساتھ ساتھ معاش کا بھی ایک اہم ذریعہ ہے۔ اس کے پھل، پھول اور سوکھی لکڑیوں کے ذریعے لوگوں کو معاشی طور پر سہارا ملتا ہے۔

۲. پیڑ پودے ماحول کو خوبصورت، خوش گوار اور دل کش، صاف وشفاف فضا اور ماحول کو پر لطف وپاکیزہ بنانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

۳. درخت بھوکے لوگوں کو زندگی بخشتا ہے اور بے گھروں کو بسیرا فراہم کرتا ہے۔ بیشتر پرندوں کو آشیانہ۔

۴. درخت ہمیں آکسیجن فراہم کرتے ہیں اور ہم سے خارج ہونیوالے کاربن ڈائی آکسائڈ کو اپنے اندر کھینچ کر ماحولیات کو صاف کرتے ہیں۔

۵. ماحولیات و نباتات کی تحقیق کے مطابق دوخاندانوں سے خارج شدہ کاربن ڈائی آکسائیڈ کو جذب کر کے ہوا میں وافر مقدار میں آکسیجن پیدا کرنے کے لئے ایک اوسط سائز کا درخت کافی ہے۔

۶. درخت ہوا کو صاف کرتے ہیں اور طوفانوں کے زور کو کم کرنے میں مددگار ہوتے ہیں۔

۷. درخت آب وہوا کے توازن کو برقرار رکھتے ہیں۔

۸. درخت درجۂ حرارت کو کم کر کے اس میں اعتدال وتوازن کو برقرار رکھتے ہیں اور دس درخت ایک ٹن ائیر کنڈیشنز کے برابر ٹھنڈک مہیا کرتے ہیں۔

۹. ایک درخت پورے دو خاندان کو اور چھتیس چھوٹے چھوٹے بچوں کو آکسیجن فراہم کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

۱۰. درختوں کے اندر دواؤں کا خزانہ موجود ہے، ان کی چھال، بیج، پتے، پھل اور پھول سب کے سب دواؤں میں استعمال ہوتے ہیں۔

۱۱. درخت کے رس اور گوند سے صنعتی کاروبار چلتے ہیں جیسے ربر(rubber)، گوند، کھجور اور تاڑ کا رس، پھل، روغنیات، شہد، دواؤں کی جڑی بوٹیاں، مختلف اقسام کے ریشے، گندہ بروز، ابریشم، لاکھ وغیرہ۔

درخت کی اہمیت قرآن میں: شجر کاری کے فوائد کے بارے میں سائنس آج تحقیق کر رہی

ہے۔ قرآن وحدیث چودہ سو سال پہلے آگاہ کر چکے ہیں۔

قرآن پاک کائنات کا ایک مکمل و مربوط نظریہ پیش کرتا ہے، جہاں انسانی روح اور ماحول، دل ودماغ اور مادّہ ایک ہی زندگی کا حصہ ہیں، لہذا یہ انسان اور فطرت کو کسی قسم کا نقصان پہنچائے بغیر متوازن، معتدل اور ماحول دوست زندگی گزارنے کی تاکید کرتا ہے۔

قرآن کریم میں تقریباً ۹۵ مقامات پر درختوں کی افادیت کا تذکرہ مختلف حوالوں سے بیان کیا گیا ہے، اور موقع کی حیثیت سے کہیں مبارک کہا تو کہیں محل امتنان کہا۔ ارشاد ہے: ''يُنبِتُ لَكُم بِهِ الزَّرْعَ وَالزَّيْتُونَ وَالنَّخِيلَ وَالأَعْنَابَ وَمِن كُلِّ الثَّمَرَاتِ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ'' (وہی [اللہ] اس پانی کے ذریعے سے کھیتیاں اگاتا ہے اور زیتون اور کھجور اور انگور اور طرح طرح کے دوسرے پھل پیدا کرتا ہے۔ اس میں ایک بڑی نشانی ہے ان لوگوں کے لئے جو غور وفکر کرتے ہیں)[۹]۔

سورہ تین میں اللہ تعالیٰ نے انجیر اور زیتون کی قسم کھاتے ہوئے فرمایا ''وَالتِّينِ وَالزَّيْتُونِ وَطُورِ سِينِينَ''، قسم زیتون کی اور انجیر کی اور طور سینا کی[۱۰]۔

ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ نے زیتون کے تیل کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: ''وَشَجَرَةً تَخْرُجُ مِن طُورِ سَيْنَاء تَنبُتُ بِالدُّهْنِ وَصِبْغٍ لِّلْآكِلِينَ'' (اور وہ درخت بھی ہم نے پیدا کیا جو طور سینا سے نکلتا ہے، تیل بھی لئے ہوئے اگتا ہے اور کھانے والوں کے لئے سالن بھی) (سورۃ المؤمنون آیت: ۲۰)[۱۱]۔

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ اس کو مخلوقات کے واسطے برکت والا کہا ہے، ارشاد ہے۔ ''شَجَرَةٍ مُّبَارَكَةٍ زَيْتُونَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَلَا غَرْبِيَّةٍ'' (ایسے مبارک درخت کے تیل سے روشن کیا جاتا ہو جو نہ شرقی ہو نہ غربی ہو)۔[۱۲]

اللہ نے سورۂ یٰس میں درخت کا ذکر آگ کے حوالے سے کیا جو کہ انسانی زندگی کا لازمی حصہ

---

[۹] سورہ النحل، آیت ۱۲

[۱۰] سورۃ التین، آیت ۱-۲

[۱۱] سورۃ المؤمنون، آیت ۲۰

[۱۲] سورۃ النور، آیت ۳۵

ہے۔ ارشاد فرمایا: ''الَّذِي جَعَلَ لَكُم مِّنَ الشَّجَرِ الْأَخْضَرِ نَارًا فَإِذَا أَنتُم مِّنْهُ تُوقِدُونَ''۔[۱۳] (وہی جس نے تمہارے لئے ہرے بھرے درخت سے آگ پیدا کر دیا اور تم اس سے اپنے چولہے روشن کرتے ہو)۔

اللہ تعالیٰ نے زمین کی ہر شئ کو زمین کی زینت فرمایا: ''إِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْأَرْضِ زِينَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ أَيُّهُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا''[۱۴] (جو کچھ سروسامان بھی زمین پر ہے، اس کو ہم نے زمین کی زینت بنایا ہے، تاکہ ان لوگوں کو آزمائیں کہ ان میں کون بہتر عمل کرنے والا ہے)۔

ایک جگہ اللہ تعالیٰ نے درخت اور اس کے پھل کے اقسام بیان کرتے ہوئے فرمایا: ''وَفِي الأَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجَاوِرَاتٌ وَجَنَّاتٌ مِّنْ أَعْنَابٍ وَزَرْعٌ وَنَخِيلٌ صِنْوَانٌ وَغَيْرُ صِنْوَانٍ يُسْقَى بِمَاء وَاحِدٍ وَنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلَى بَعْضٍ فِي الأُكُلِ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ''(اور دیکھو زمین میں الگ الگ خطّے ہیں جو ایک دوسرے سے متصل ہیں، انگور کے باغ ہیں، کھیتیاں ہیں، کھجور کے درخت ہیں جن میں کچھ اکہرے ہیں اور کچھ دوہرے۔ سب کو ایک ہی پانی سیراب کرتا ہے، مگر مزے میں ہم کسی کو بہتر بنادیتے ہیں اور کسی کو کمتر۔ ان سب چیزوں میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو عقل سے کام لیتے ہیں)[۱۵]۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے سورۃ النمل میں فرمایا: ''بھلا وہ کون ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور تمہارے لئے آسمان سے پانی برسایا پھر اس کے ذریعے سے وہ خوشنما باغ اگائے، جن درختوں کا اگانا تمہارے بس میں نہ تھا؟ کیا اللہ کیساتھ کوئی دوسرا خدا بھی (ان کاموں میں شریک) ہے؟ نہیں۔''[۱۶] (تفہیم القرآن)

یہی وجہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے نسل، کھیتی باڑی کو تباہ کرنے والوں کی مذمت کی: ''وَإِذَا تَوَلَّى سَعَى فِي الأَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيِهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ وَاللّهُ لاَ يُحِبُّ الفَسَادَ''(زمین میں اس کی ساری دوڑ دھوپ اس لئے ہوتی ہے کہ فساد پھیلائے، کھیتوں کو غارت کرے اور نسل انسانی

---

[۱۳] سورۃ یٰس، آیت ۸۰

[۱۴] سورۃ الکہف، آیت ۷

[۱۵] سورۃ الرعد، آیت ۴

[۱۶] سورۃ النمل، آیت ۶۰

کو تباہ کرے حالانکہ اللہ فساد ہرگز پسند نہیں کرتا)۔[۱۷]

قرآن و حدیث میں صرف درخت کے فوائد کا ذکر نہیں بلکہ درخت لگانے اور اس کی حفاظت کرنے کی ترغیب بھی دی گئی ہے۔

حدیثِ مبارکہ میں درخت لگانے کی اہمیت: رب العٰلمین نے سرورِ کائنات کو صرف انسانوں کے لئے رحمت للعٰلمین بنا کر نہیں بھیجا بلکہ ساری کائنات کے لئے رحمت للعٰلمین بنایا ہے، چاہے وہ چرند و پرند ہو یا پیڑ پودے ہوں۔ اور آپ ﷺ نے صرف زبانی احکام بیان کر دیے ہوں ایسا نہیں بلکہ آپ نے اس کو عملاً کر کے بھی دکھایا لہٰذا جس طرح درخت کی اہمیت کے متعلق احادیث مبارکہ میں روایات موجود ہیں ویسے ہی حضور ﷺ کا عملا درخت لگانے کی روایت بھی ملتی ہے۔ لہٰذا شجرکاری نبی ﷺ کی صرف قولی سنت نہیں ہے بلکہ عملی سنت بھی ہے۔

حضور ﷺ نے درخت لگانے کو صدقۂ جاریہ فرمایا ہے۔ ارشاد ہے: ''ما من مسلم یزرع زرعا أو یغرس غرسا فیأكل منه طیر أو إنسان أو بهیمة إلا كان له به صدقة''[۱۸] اگر کسی مسلمان نے کوئی درخت یا پودا لگایا اور اس سے پرندے، انسان یا جانور کھا لیتا ہے تو وہ اس شخص کے حق میں صدقہ ہوتا ہے۔

اللہ کے رسول ﷺ نے کاشت کاری و شجرکاری میں سستی کرنے سے منع کیا ہے اور قیامت آنے تک اس کام کو جاری رکھنے کی ترغیب دی ہے۔ نبی ﷺ کا ارشاد ہے: ''عن أنس بن مالک قال: قال رسول الله ﷺ: إن قامت الساعة وفی ید أحدكم فسیلة، فإن استطاع أن لاتقوم حتی یغرسها فلیغرسها فله بذلک أجر'' اگر قیامت قائم ہو جائے اور تم میں سے کسی کے ہاتھ میں کوئی پودا ہو تو اگر تم اسے لگا سکتے ہو تو لگا دو، اس سے تم کو اجر و ثواب ملے گا[۱۹]۔

مسند احمد کی ایک دوسری حدیث میں ہے: ''من غرس غرسا كتب الله عزوجل له من الاجر بقدر ما یخرج من ثمار ذٰلک الغرس'' جو شخص کوئی پودا لگائے گا تو اللہ عزوجل اس پودے

---

[۱۷] سورۃ البقرۃ، آیت ۲۰۵

[۱۸] صحیح بخاری: ۲۱۵۲، دار ابن کثیر، دمشق، بیروت، ۱۹۹۳ء

[۱۹] مسند احمد، ۱۲۵۱۲، دار القلم، دمشق، ۲۰۱۳ء

سے پیدا ہونے والے پھل کے برابر اسے ثواب عطا فرمائیں گے[۲۰]۔

ایک دوسری روایت میں کہا گیا ہے کہ اس کا ثواب قیامت تک ملتا رہے گا یعنی یہ اس کے لئے صدقۂ جاریہ ہو گا: "لا يغرس المسلم غرساً فيأكل منه إنسان ولا دابة ولا طير إلا كان له صدقة إلى يوم القيامة"، یعنی اگر کسی مسلم نے کوئی درخت لگایا اور اس سے انسان، چوپایا، یا کسی پرندے نے کھا لیا تو یہ قیامت تک کے لئے صدقہ ہو گا[۲۱]۔

اس کے علاوہ بے شمار احادیث ہیں جس میں درخت لگانے کی ترغیب ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو شخص اپنے ہاتھ کی محنت سے بوجھل ہو کر شام کرے تو اللہ عزوجل اس کی مغفرت فرماتے ہیں "من بات كالّا من عمل يده، بات مغفورا له"[۲۲]۔

نبی کریم ﷺ نے حالات جنگ میں بھی درخت کو نقصان پہنچانے کو ممنوع قرار دیا۔ آپ ﷺ لشکر کی روانگی کے وقت دیگر ہدایات کے ساتھ ایک ہدایت یہ بھی فرماتے تھے کہ "کھیتی کو نہ جلانا اور کسی پھل دار درخت کو مت کاٹنا"۔[۲۳]

مذکورہ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن وحدیث میں درخت لگانے کی ترغیب کس قدر آئی ہے۔ سب سے آخر میں ایک عملی حدیث پیش کرتا ہوں تاکہ اسلام کی عملی تعلیمات کی بھی وضاحت ہو جائے۔ الخصائص الکبری فی المعجزات خیر الوریٰ میں جلال الدین سیوطیؒ نے بیان کیا کہ سلمان فارسیؓ ایک یہودی کے غلام تھے۔ وہ ایمان لانے سے پہلے ہی حضور ﷺ کی علامات واوصاف، مقام ہجرت وغیرہ کے متعلق مختلف عیسائی راہبوں کی زبان سے سن چکے تھے۔ جب حضور ﷺ ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے تو سلمان فارسی بھی آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور جو کچھ انھوں نے سنا تھا، اللہ کے رسول کو اس سے بھی زیادہ اوصاف حمیدہ وخصائل جمیلہ کے ساتھ متصف پایا۔ چنانچہ آپ نے بھی اسلام قبول کر لیا تو حضور ﷺ نے فرمایا: مکاتب ہو جاؤ۔ مکاتبہ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ غلام اپنے مالک سے کچھ مالیات کے عوض اس

---

[۲۰] مسند احمد ۲۲۴۲۰

[۲۱] صحیح البخاری: ۲۱۹۵

[۲۲] فتح الباری: ج ا، حدیث نمبر ۳۰۴

[۲۳] مسند أحمد: أحمد بن حنبل ج ۴، حدیث نمبر ۲۳۴۶

سے آزاد ہو جائے۔ اس کے عوض میں جو مال متعین ہو اسے بدل کتابت کہا جاتا ہے۔ جب وہ مال آقا کو دیدے گا تو وہ آزاد ہو جائے گا۔ چنانچہ حضرت سلمان فارسیؓ کا بدل کتابت تین سو کھجور کے درخت لگا کر اس کے پھلدار ہونے تک نگہبانی اور چالیس اوقیہ سونا طے ہوا۔ اس کے بعد سلمان فارسیؓ حضور کے خدمت میں حاضر ہوئے اور صورت حال سے آگاہ کیا۔ تو آپؐ نے ان کی حوصلہ افزائی کی۔ حضرت سلمان فارسیؓ فرماتے ہیں کہ صحابۂ کرامؓ نے کھجور کے پودوں کی فراہمی میں میری مدد کی۔ کسی نے تیس، کسی نے بیس اور کسی نے دس پودے دیے۔ پھر رسول اکرم ﷺ نے مجھے پودوں کے واسطے گڑھے کھودنے کا حکم دیا اور فرمایا جب گڑھے تیار ہو جائیں تو مجھے بلالینا، میں بذاتِ خود پودوں کو اپنے ہاتھوں سے لگاؤں گا۔ چنانچہ میں نے متعینہ زمین میں گڑھے کھودنا شروع کیا تو صحابہؓ کرام نے اسمیں بھی میری مدد کی۔ وہ جہاں جہاں نشان لگاتے میں گڑھے کھودتا۔ جب کھدائی مکمل ہو گئی تو رسول اللہ ﷺ تشریف لائے اور اپنے دست مبارک سے انہیں لگاتے اور مٹی برابر کرتے۔ سلمان فارسیؓ فرماتے ہیں: قسم ہے اس ذات کی جس نے حضور ﷺ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا، سارے درخت سرسبز و شاداب ہو گئے اور اسی سال پھل دینا شروع کر دیا، سوائے ایک درخت کے جسے غالب گمان ہے کہ میں نے لگایا تھا، وہ خشک ہو گیا تھا۔ حضور ﷺ نے دریافت کیا اور اسے پھر سے اکھاڑ کر دوبارہ اسے اپنے ہاتھ سے لگایا اور وہ بھی اسی سال پھل دینے لگا۔ اس طرح تین سو درختوں کی شجر کاری مکمل ہو گئی[۲۴]۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اسلام دین فطرت ہے اور اسلام کا کوئی ایسا حکم نہیں ہے جو فطرت کے خلاف ہو۔ کوئی بھی ایسا حکم نہیں ہے جو دنیا کی کسی بھی شئی کے لئے نقصان دہ ہو، چاہے دنیا کی کوئی بھی چیز ہو (انسان، جانور، فضا، پہاڑ، دریا)۔ دنیا کی ہر شئی کے لئے اس کی فطرت کے مطابق حکم ہے، اور جو بھی حکم بظاہر خلافِ فطرت نظر آتا ہو وہ ہمارے علم و فہم کی کمی ہے نہ کہ اسلام کی کمی، اور جو تحقیق شدہ خلاف فطرت حکم ہو وہ اسلام کا حکم نہیں ہو سکتا۔ شجر کاری ایک حکم شرعی ہے، باعثِ اجر و ثواب ہے، ملک و ماحول کے لئے ذریعۂ تزئین و آرائش اور اپنے تمام تر مادی و روحانی فوائد کے ساتھ ساتھ انسانیت کی ایک عظیم خدمت ہے۔

---

(۲۴) الخصائص الکبری فی معجزات خیر الوریٰ (ترتیب مولانا عبد الاحد قادری)، ممتاز اکیڈمی، فضل الٰہی مارکیٹ، اردو بازار، لاہور، جلد اول، ص ۴۴۔ ۵۱

مسلمان خاتون کے حوالے سے اردو زبان کی چند اہم تصانیف:

ایک جائزہ

ڈاکٹر افروز احمد بساطی

ایسو سی ایٹ پروفیسر، شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، اسلامک یونیورسٹی آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی، کشمیر

afrozdaniya@gmail.co

ارشید احمد شیخ

ریسرچ اسکالر، شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، اسلامک یونیورسٹی آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی، کشمیر

arshidijt84@gmail.com

اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے اور یہ رہتی دنیا تک پوری انسانیت کے لیے قابل تقلید نمونہ ہے۔ اس کی تعلیمات اور احکام عدل و انصاف ہر انسان کے لیے ہیں۔ عصر حاضر میں اسلام کے متعلق جو غلط فہمیاں مغرب سے مرعوب مسلمانوں یا مستشرقین اور عیسائی مشنریز کی طرف سے پھیلائی گئی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اسلام نے عورتوں پر ظلم کیا ہے اور ان کی مستقل حیثیت تسلیم نہیں کی ہے، ان کو گھر کی چار دیواری میں بند کیا گیا اور مردوں کے مساوی حیثیت نہیں دی بلکہ ان کو تعلیم اور خود اختیاری سے محروم کر کے ان کو مردوں کا تابع بنا دیا گیا۔ اس سوچ کی تردید عصر حاضر کے مسلم علماء، مفکرین اور مصلحین نے روز روشن کی طرح کی ہے کہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ انہوں نے اپنی تصانیف میں عورتوں کی حیثیت، حقوق و فرائض، اور دینی، سماجی اور سیاسی کردار اور اسلامی تاریخ میں ان کی اہمیت اور خدمات پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ اس مقالہ میں چند ایسی ہی کتابوں کا ذکر ہے جو خواتین کی بابت اسلام کے موقف کی وضاحت کرتی ہیں۔

ا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور خواتین: ایک سماجی مطالعہ

زیر نظر کتاب ڈاکٹر یٰسین مظہر صدیقی کے قلم سے ہے اور واضح کرتی ہے کہ نبوی معاشرے میں مرد وزن کے تعلقات کن قدروں پر مشتمل تھے، یہ ایک جامع اور منفرد کتاب ہے۔ جس کو

اسلامک بک فاؤنڈیشن نئی دہلی نے ۲۰۰۶ میں شائع کیا۔ قریب بارہ مضامین پر مشتمل اس کتاب میں عالمانہ گفتگو کی گئی ہے۔

ابتدا میں عہد نبویؐ کی خواتین اور رسول اکرمؐ سے ان کی ملاقاتوں کا ذکر ہے۔ اور تاریخی شواہد و روایات سے بتایا گیا ہے کہ رسول رحمت ﷺ کی مکہ کے زمانہ قیام میں کن خواتین کے ہاں آمد و رفت تھی۔ نیز صحابہ حضرات و صحابیات کے باہمی رشتوں اور ملاقاتوں کا بھی ذکر ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس قسم کی ملاقاتوں میں بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کو بھی اپنے ساتھ لے جاتے تھے اور یہ بھی بتایا گیا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور خواتین کی اس قسم کی ملاقاتوں سے کتنے معاشرتی اصول وجود میں آئے۔

مصنف نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں خواتین نے کس طرح اجتماعی کاموں جیسے غزوات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ بعض خواتین تو مستقل مجاہدات کے زمرے میں آتی ہیں۔ مصنف نے لکھا: ”روایات سوانح، آثار سیرت اور احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم بتاتی ہیں کہ اول روز جہاد سے مسلم خواتین اور صحابیات عصر میں روح جہاد موجود تھی۔ وہ اپنے مردوں کی طرح اسلامی خدمت، کلمہ الٰہی کی بلندی اور دین و معاشرے کی مدافعت کے لئے تلوار اٹھا سکتی تھیں اور اپنے مجاہدوں کی خدمت کر سکتی تھیں۔ جہاد و قتال بظاہر صرف مردانہ کام ہے۔ اس کے باوجود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد خواتین اسلام کو مختلف غزوات و مہمات میں شرکت کی اجازت مرحمت فرمائی“ (ص:۱۹)۔ نبوی عہد میں خواتین اسلام کی معاشی و تجارتی سرگرمیوں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے کہ خواتین پر اگرچہ معاشی ذمہ داری نہیں ہے مگر یہ ان کا حق ہے کہ وہ معاشی اور تجارتی سرگرمیاں انجام دے سکتی ہیں اس کی مثال میں عہد نبویؐ کی خواتین کو پیش کیا گیا۔ ان خدمات میں رضاعت، حضانت، زراعت، جراحت، ختنہ گری، مشّاطگی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

بعض خواتین کی شکایات اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ان کے ازالہ کا بھی ذکر کیا ہے۔

۲۔ اسلام میں خواتین کے حقوق

ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی یہ تصنیف عورتوں کے حقوق پر لکھی جانے والی ایک جامع اور دلچسپ کتاب ہے۔ جو قرآن، حدیث، آثار صحابہ اور سیرت کے مستند مآخذ کی روشنی میں لکھی گئی ہے۔ اس کتاب کی اشاعت منہاج القرآن پبلیکیشنز لاہور سے ۲۰۰۶ میں ہوئی ہے۔

ابتدا میں قبل از اسلام عرب معاشرے میں عورتوں کی حیثیت پر روشنی ڈالی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ ان کو احترام اور ملکیت بلکہ زندہ رہنے کا بھی حق نہیں تھا۔ مولانا نے لکھا کہ: ”شادی جو خاندانی زندگی کے قیام و تسلسل کا ادارہ ہے، اہل عرب کے ہاں اصول وضوابط سے آزاد تھا جس میں عورت کی عزت وعصمت اور عفت وتکریم کا کوئی تصور کارفرمانہ تھا“ (ص:۱۶)۔ یہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ اسلام نے کس طرح عزت واحترام اور انسانی تکریم اور اجروثواب میں مردوعورت کو برابر کا حق دیا۔

کتاب میں عورتوں کے انفرادی حقوق مثلاً عصمت وعفت، عزت ورازداری، تعلیم وتربیت، حسن سلوک، ملکیت اور جائیداد اور حرمت نکاح پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ عائلی حقوق میں ماں، بیٹی، بہن اور بیوی کی حیثیت اور ازدواجی حقوق مثلاً شادی کا حق، مہر کا حق، خیار بلوغ کا حق، حقوق زوجیت، کفالت کا حق، اعتماد کا حق، حسن سلوک کا حق، تشدد سے تحفظ کا حق، بچوں کی پرورش کا حق اور خلع کا حق وغیرہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے بعد مصنف نے طلاق کے بعد عورت کے بعض اور حقوق کا ذکر کیا ہے مثلاً مہر کا حق، میراث کا حق اور حضانت کا حق۔ معاشی حقوق میں مثلاً والدین اور شوہر کے مال وراثت میں حق اور کلالہ کے مال وراثت میں حق کا ذکر کیا گیا پھر عورت کے قانونی حقوق مثلاً قانونی شخصیت ہونے کا حق اور گواہی کا حق، پر گفتگو کی گئی ہے۔ آخر میں عورت کے سیاسی حقوق مثلاً عورت کا ریاستی کردار، رائے دہی کا حق، مقنّنہ میں نمائندگی کا حق، عورت بطور سیاسی مشیر، انتظامی ذمہ داریوں پر تقرری کا حق، سفارتی مناصب پر فائز ہونے کا حق، ریاست کی دفاعی ذمہ داریوں میں نمائندگی کا حق، حق امان دہی اور مسلم معاشرے میں عورت کے کردار پر بحث کی گئی ہے۔

۳۔ اسلام اور عورت

یہ مولانا محمد مظہر الدین صدیقی کی کتاب ہے اور یہ اپنے موضوع پر بڑی جامع اور مکمل ہے۔ اس کو خرم پبلی کیشنز نے شائع کیا ہے۔ کتاب چھ ابواب پر مشتمل ہے۔ سب سے پہلے مولانا نے جنسی مساوات یعنی قابل قبول اور ناقابل قبول جنسی برابری کو واضح کیا ہے۔ پھر اسلام کے تصور مساوات جنسی پر روشنی ڈالی ہے اور اس بات کو واضح کیا ہے کہ اللہ کی نظر میں مرد اور عورت انسانیت، مرتبہ، حقوق اور عزت کے لحاظ سے مساوی ہیں۔ اسی طرح اس بات کو بھی واضح کیا ہے کہ معاشیات، سیاسیات، تعلیم، روحانی ارتقا، اخلاقی حدود، مذہبی فرائض اور خانگی زندگی میں بھی عورت

اور مرد یکساں اور مساوی حقوق رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ اسلام میں جنسی فرق وامتیاز کی حقیقت کو بیان کیا ہے کہ مرد اور عورت طبی، نفسیاتی اور جسمانی لحاظ سے مختلف ہیں اور ان کی حیثیت باہم حریفانہ نہیں ہے بلکہ وہ ایک دوسرے کی شخصیت کی تکمیل کرتے ہیں۔ مولانا نے واضح کیا کہ اسلام نے مردوں اور عورتوں کی مساوی حیثیت تسلیم کرتے ہوئے ان کے فروق واختلافات کو بھی مد نظر رکھا ہے۔ ساتھ ہی مولانا نے مغربی حکماء اور ماہرین نفسیات کے بیانات کا بھی جائزہ لیا ہے۔

مولانا نے اسلام کے تصور نکاح پر گفتگو کرتے ہوئے اس کی اہمیت، افادیت اور اغراض کو روز روشن کی طرح عیاں کیا ہے۔ اور تفصیل سے ازدواجی اور خاندانی زندگی پر کیے جانے والے اعتراضات اور مغربی مفکرین کی آراء کا جائزہ لے کر ثابت کیا ہے کہ خاندانی زندگی کتنی ضروری، قیمتی اور بچوں کی تربیت، باہمی محبت اور رحمت کے لحاظ سے کتنی ضروری ہے۔ اس کے علاوہ نکاح کرنے، نکاح کی شرائط، تحلیل نکاح کا حق، جیسے قانونی، معاشی اور انفرادی شخصیت کے حقوق پر بھی تفصیل سے بحث کی ہے۔

ایک باب میں مولانا نے طلاق کے بارے میں اسلام کے نقطۂ نظر کو اور شرائط طلاق کے متعلق اسلامی تعلیمات کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ یہ بھی واضح کیا ہے کہ مردوں کی طرح عورتوں کو بھی نکاح سے خلاصی حاصل کرنے کا حق ہے۔ اسی طرح تفریق زوجین کے اسباب مثلاً شوہر کی بد سلوکی، نفرت زوج، عدم ادائی نفقہ، ارتداد، خیار بلوغ، ضعف رجولیت، متعدی امراض کا وجود اور شوہر کی مفقود الخبری، پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ ایک اور باب میں مولانا نے اسلام میں پردے کے مسئلے پر مفصل بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ عورتوں کو بغیر کسی جائز ضرورت کے خواہ وہ معاشی ہو سیاسی ہو یا تمدنی، گھر سے باہر نہ آنا چاہیے۔ البتہ ضرورت کے وقت اپنے حسن و جمال کو ظاہر کیے بغیر وہ باہر نکل سکتی ہیں۔ اسی طرح عورتوں کو گھر سے باہر نکلتے وقت چہرہ اور ہاتھ چھپانا ضروری نہیں ہے۔ بقول مولانا ”عورتوں کو اسلام نے اجازت دی ہے کہ وہ بوقت ضرورت چہرہ کھول کر باہر آجائیں “(ص:۴۳۱)۔ اس کی تائید میں مولانا نے قرآن، حدیث، آثار صحابہ، اقوال تابعین و تبع تابعین اور اقوال ائمہ اور مفسرین کو بطور دلیل پیش کیا ہے۔

علاوہ ازیں اسلام میں اختلاط مرد و زن کی شرعی حیثیت اور عہد رسالت میں عورتوں کی معاشی، سیاسی اور جنگی خدمات کو بھی اجاگر کیا ہے۔ اس کے بعد مولانا نے مغربی مفکرین کی آراء کی

روشنی میں تعدد ازواج کی اہمیت اور اسباب پر تفصیل سے گفتگو کی ہے اور اس بات کو بھی عیاں کیا ہے کہ اسلام نے تعدد ازواج کی اجازت کیوں دی ہے، کن حالات میں دی ہے اور کن شرائط کے ساتھ دی ہے۔ آخر میں مولانا نے اسلام کی آمد سے قبل عرب معاشرے میں عورتوں کی جو حالت تھی اور اسلام میں اس حالت میں جو اصلاح و تبدیلی آئی اس پر بحث کی ہے۔ مولانا نے پردے کے موجودہ رواج، عورتوں کی خانہ نشینی اور معاشرتی، سیاسی اور تمدنی معاملات سے ان کی بے تعلقی کو بادشاہوں اور امراء کی پیداوار قرار دیا ہے اور بتایا ہے کہ اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ پھر اس بات کو بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ عورت صنعتی امور، طبّی خدمات، دفاعی تیاریوں اور جنگی تربیت میں حصہ لے سکتی ہیں مگر یہ سب خاندانی نظام کی پائداری، عصمت وعفت کی حفاظت اور احتیاطی تدابیر کو ملحوظ رکھتے ہوئے۔

۴۔ اسلامی معاشرے میں خواتین کا مقام اور متوقع کردار

ڈاکٹر یوسف القرضاوی کی یہ کتاب اسلام میں عورت کے موضوع پر ایک قیمتی دستاویز ہے۔ اس کتاب کو ہدایت پبلیکیشنز اینڈ ڈسٹریبیوٹرس نے ۲۲۰۲ میں نئی دہلی سے شائع کیا ہے۔ اس سے پہلے بھی مصنف نے متعدد کتابوں بالخصوص الحلال والحرام اور فتاوی معاصرہ میں خواتین اور خاندان کے مسائل پر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ الیاس نعمانی ندوی نے اس کتاب کا اردو میں ترجمہ کیا۔ یہ کتاب خواتین کے مسائل پر اسلام کے نظریہ اعتدال کی عکاسی کرتی ہے۔ اس میں عورت کے مقام و مرتبہ پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ مرد اور عورت اسلام کی نگاہ میں بحیثیت انسان یکساں ہیں۔ دینی اور سماجی احکام کے سلسلے میں بھی ہم مرتبہ ہیں اور ثواب، جزا وسزا نیز دخول جنت کے اعتبار سے بھی برابر ہیں۔ اسی طرح عورت کی حیثیت پر جو اعتراضات کیے جاتے ہیں ان کا بھی قرآن و حدیث کی روشنی میں مدلل جواب دیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے خواتین کے حقوق کا بھی تذکرہ کیا ہے اور گواہی، میراث، دیت، گھر کی سربراہی اور مملکت کی سربراہی کے معاملے میں اسلام نے مرد اور عورت میں جو فرق کیا ہے اس کی حکمت کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔

اس کے بعد بتایا گیا ہے کہ مرد اور عورت باہم حریف اور مقابل نہیں ہیں بلکہ وہ ایک دوسرے کی شخصیت کی تکمیل کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں عورت کی نسوانیت کے بابت اسلام کے

موقف کو وضاحت سے بیان کیا ہے تاکہ خواتین کی حیا اور عفت محفوظ رہے اور انہیں دل و دماغ کی پریشانیوں سے بھی نجات ملے۔ اختلاط پر بات کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں ”ہر اختلاط ممنوع نہیں ہے جیسا کہ سخت گیر لوگ سمجھتے اور سمجھانا چاہتے ہیں اسی طرح اختلاط مشروع بھی نہیں ہے جیسا کہ مغرب پرست کہا کرتے ہیں“ (ص:۵۳)۔ اس امر کو ثابت کرنے کے لیے انہوں نے پہلے عہد نبویؐ اور خلفائے راشدین کے دور کی خواتین کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ وہ نماز فجر، نماز عشاء، نماز جمعہ، نماز عید، مسجد اور عید گاہ میں پڑھتی تھیں، علمی مجلسوں میں حاضر ہوتی تھیں اور دین سیکھتی تھیں، غزوات میں شرکت کرتی تھیں اور مختلف خدمات انجام دیتی تھیں اور دعوت الی اللہ کا فریضہ انجام دیتی تھیں۔ پھر قرآن کی روشنی میں مختلف زمانوں کی خواتین اور مختلف رسولوں کے مابین ملاقاتوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے حدود نا آشنا اختلاط مرد و زن کے حامیوں کے اعتراضات کا جواب بھی دیا ہے اور مغربی معاشروں میں آزاد اختلاط مرد و زن کے نتائج مثلاً اخلاقی زوال، ناجائز اولاد کی کثرت، غیر شادی شدہ نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی کثرت، خاندانی نظام کی تباہی اور طلاق کی کثرت اور مہلک امراض کی کثرت، کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے زمانہ جاہلیت اور قدیم قوانین میں خواتین کی جو ناگفتہ بہ حالت تھی اس کو بیان کر کے اسلام نے ماں، بیٹی اور بیوی کی حیثیت سے خواتین کو جو عزت، حقوق اور مقام و مرتبہ عطا کیا ہے اور جو ذمہ داریاں سونپی ہیں، اس پر تفصیل سے بات کی ہے۔

طلاق پر گفتگو میں بتایا کہ اسلام نے طلاق کو کیوں جائز ٹھہرایا ہے اور اس کی حکمت کو بیان کیا ہے نکاح کے بابت اسلام کی ان تعلیمات اور ہدایات کو بھی بیان کیا ہے جن کی اگر مسلمان اتباع کریں گے تو طلاق کے امکانات نہایت کم ہوں گے۔ اسلام نے طلاق دینے اور اس کے بعد کے جو اصول و احکام مقرر کیے ہیں ان پر بھی گفتگو کی گئی ہے اور معترضین کے اس اعتراض یعنی طلاق کا اختیار صرف مرد کو ہی کیوں دیا گیا ہے کا جواب بھی مدلل انداز میں دیا ہے۔ علاوہ ازیں ڈاکٹر صاحب نے اسلام میں عورت کے حق تفریق پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور مسلمانوں میں طلاق کے بابت غلط فہمی اور اس کی غلط تنفیذ پر بھی بحث کی ہے۔ اس میں ڈاکٹر صاحب نے مختلف چیزوں مثلاً اسلام میں تعدد ازدواج کی اجازت کیوں دی گئی ہے، اس کی حکمت، شرط اور حد کیا ہے، تعدد ازواج کی تاریخ کیا ہے، تعدد ازدواج ایک اخلاقی اور انسانی نظام کیسے ہے، مغربی معاشرے

میں غیر قانونی تعدد کی حقیقت، مسلم معاشرے میں تعدد ازدواج کی رخصت کا غلط استعمال اور تعدد ازدواج پر مغرب نوازوں کی طرف سے کیے جانے والے اعتراضات اور شریعت کی روشنی میں ان کے جوابات، پر تفصیل سے بحث کی ہے۔

آخر میں ڈاکٹر صاحب نے خواتین کے تیئں اسلام کے نقطۂ نظر کی مفصل وضاحت کی ہے اور اسلام میں خواتین کے حقوق کو قرآن، حدیث اور تاریخی شواہد کی روشنی میں بیان کیا ہے۔ اس کے بعد خواتین کی سماجی اور معاشی سرگرمیوں کی بابت غلو پسندوں کے دلائل کا بھی مدلل جواب دیا ہے اور مردوں کے کاموں میں خواتین کی شرکت کے نقصانات کو بھی عیاں کیا ہے اور اس بات کو بھی واضح کیا ہے کہ خواتین کے لیے گھر سے باہر کس حد تک اور کن میدانوں میں شریعت نے کام کرنے کی اجازت دی ہے۔

۵۔ اسلام کے عائلی قوانین

یہ کتاب ان مقالات پر مشتمل ہے جن کو مولانا سید احمد عروج قادری رحمہ اللہ نے مختلف اوقات میں لکھا تھا۔ یہ کتاب ۲۰۱۷ء میں مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشر نئی دہلی نے شائع کی ہے۔ یہ تین ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اول میں مسلم پرسنل لا کی اہمیت اور اس کے تعارف اور مسلم پرسنل لا پر کیے جانے والے اعتراضات کا جائزہ لے کر ان کا مدلل انداز میں جواب دیا گیا ہے۔ مسلم پرسنل لا کی بابت مسلمانوں کی ذمہ داریوں کو اور مسلم پرسنل لا کے تحفظ کے لیے جو پیش رفت ہوئی اس کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے۔ ہندوستان میں مسلم پرسنل لا کو تبدیل کرنے کی جو حکومتی جدوجہد ہو رہی ہے اس پر اور پاکستانی حکومت کے منظور کردہ عائلی قانون اور اس کی غیر اسلامیت اور غیر معقولیت پر تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے۔

باب دوم میں پہلے نکاح، مہر، نان و نفقہ، میاں بیوی کے درمیان بہتر تعلقات اور ان کے حقوق و فرائض اور طلاق و خلع کے اصول و قواعد پر اور قرآن و حدیث کی روشنی میں تعدد ازواج کی شرعی حیثیت پر بحث کی گئی ہے اور ساتھ ہی ساتھ موجودہ زمانے میں تعدد ازواج پر متجددین کے نقطۂ نظر پر بھی اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ تعدد ازواج پر مولانا لکھتے ہیں کہ "حقیقت یہی ہے کہ قرآن، حدیث، اجماع امت، نبی ﷺ اور ان کے صحابہؓ کے عمل اور پونے چودہ سو سال کے دینی ریکارڈ سے جو بات بغیر کسی ادنی اشتباہ اور ابہام کے معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ تعدد ازواج کے لیے اللہ

تعالیٰ نے بیویوں کے درمیان برتاؤ میں صرف عدل کی شرط لگائی ہے۔ اسلامی شریعت میں یہ نہ کوئی ناگزیر برائی ہے جسے بہ مجبوری جائز رکھا گیا ہے اور نہ یہ حکم یتیم لڑکیوں اور بیواؤں کے مسائل کو حل کرنے کی شرط کے ساتھ مشروط ہے۔ جو لوگ اسے ناگزیر برائی قرار دے رہے ہیں یا من گھڑت شرط کے ساتھ اسے مشروط کر رہے ہیں وہ قرآن کی پیروی نہیں کر رہے ہیں، بلکہ مغربی تہذیب سے مرعوب ذہن کا مظاہرہ کر رہے ہیں" (ص:۹۹)۔ اس کے بعد تعدد ازدواج پر اعتراضات کا عقلی طور پر ازالہ کیا گیا ہے۔

مولانا نے یہ بھی لکھا کہ طلاق کا حق صرف مردوں کو ہی کیوں دیا گیا ہے اس حق کی مخالفت کرنے والوں کے اعتراضات کا بھی ازالہ کیا ہے۔ یہ وضاحتیں اور جوابات سیدھے اور سمجھنے میں آسان ہیں۔ مولانا نے ایک مجلس یا ایک لفظ میں تین طلاق کے موضوع پر مفصل بحث کی ہے، مولانا نے طلاق کا حق بیوی کو سونپنے کے تصور، شریعت میں اس کی حیثیت، اس کی حقیقت، مختلف اقسام، نفاذ کی مدت، اور کیا یہ طلاق کے غلط استعمال کو روک سکتا ہے، پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ مولانا نے شرعی قانون کے مطابق نفقہ مطلقہ کی قانونی حیثیت کے بارے میں اور نفقہ مطلقہ سے متعلق سپریم کورٹ کے فیصلے پر تبصرہ کیا ہے۔ اسلامی قانون وراثت کے بنیادی اصولوں کی وضاحت بھی کی گئی ہے اور ایک یتیم پوتے کو وراثت سے محروم کرنے کے پس پردہ حکمت اور ان کی سرپرستی کے شرعی انتظامات پر بھی بحث ہے۔

باب سوم میں ایک ہی مقالہ ہے جس کا عنوان ہے "اجتہاد کے امکانات" اس میں اجتہاد کی تعریف اور اس کے دائرہ کار کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، اجتہادی مسائل اور منصوص مسائل میں فرق واضح کیا گیا ہے اور اجتہاد کے امکانات پر گفتگو کی گئی ہے۔ کتاب کے آخر میں ایک مقالہ "قضاءِ شرعی کا قیام ضروری ہے" کے عنوان سے ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو اس بات پر ابھارا گیا ہے کہ وہ شرعی عدالتوں کے قیام کے لیے صرف جدوجہد ہی نہیں بلکہ ہر طرح کی قربانی دینے کے لیے تیار ہو جائیں۔

۶۔ معمار جہاں تو ہے: مسلمان خواتین علم و عمل کے میدان میں

اس کتاب کو ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی نے تصنیف کیا ہے اور اسے القلم پبلی کیشنز، بارہ مولہ، جموں و کشمیر نے ۲۰۲۳ء میں شائع کیا ہے۔ اس سے پہلے بھی ندوی صاحب نے خواتین کے مختلف

امور و مسائل پر متعدد کتابیں تصنیف کی۔ زیر نظر کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں اس بات پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ اسلام میں مرد اور عورت، تخلیق، جزا و سزا اور اعمال کا حساب دینے میں برابر ہیں پھر اسلام میں عورت کی قدر و منزلت کو بیان کیا گیا ہے۔ خواتین کے متعلق چند صحیح احادیث جن کی غلط تاویل و تشریح کی جاتی ہے ان پر بھی بحث کی گئی ہے۔

دوسرے باب میں ندوی صاحب نے خواتین کے ہمہ جہت ارتقا پر بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ عورت مرد سے زیادہ علم دین اور فہم دین والی ہو سکتی ہے۔ تاریخ اسلام کی روشنی میں بہت سی خواتین کا تذکرہ کیا گیا ہے جنہوں نے کتاب و سنت کے فہم اور علوم اسلامیہ کی نشر و اشاعت میں اہم خدمات انجام دی ہیں اور جن کی مجلسوں میں بڑے بڑے علماء و فقہاء و محدثین حاضر ہوتے تھے۔ مصنف ایک جگہ لکھتے ہیں: ”تاریخ کے روشن دور میں خواتین نے اپنی اصل ذمے داری: بچوں کی پیدائش، پرورش اور تعلیم و تربیت کو بہ خوبی انجام دینے کے ساتھ اسلامی حدود کی پابندی کرتے ہوئے گھر کے باہر کے بھی بہت سے کام خوش اسلوبی سے انجام دیے ہیں۔ خاص طور سے علوم کی نشر و اشاعت میں ان کی خدمات زریں حروف سے لکھے جانے کے لائق ہیں۔ اسلامیات کا میدان بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ انھوں نے تصنیف و تالیف کا کام کیا ہے، درس و تدریس کی خدمت انجام دی ہے، تعلیمی ادارے قائم کیے ہیں اور ان کی سرپرستی کی ہے، تعلیمی خدمات انجام دینے کے لیے لوگوں کو تیار کیا ہے اور ان پر اپنی دولت لٹائی ہے، غرض امت ان کے احسانات سے کبھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتی“ (ص: ۶۷)۔ خواتین نے حدیث کی کتابوں کی روایات بشمول سماع، تلاوت، اجازت دینا اور پڑھانے میں جو نمایاں کردار ادا کیا اس کا ذکر الگ سے کیا گیا ہے۔ مثلاً نفیسہ، زبیدہ، فاطمہ بنت سعد الخیر، فاطمہ، بلقیس سلطانہ اور فاطمہ شیخ اور ان کی دینی و تعلیمی خدمات کو سراہا ہے۔ اسی باب کے آخر میں ندوی صاحب نے اسلامی علوم اور خاص طور پر قرآن مجید کے ترجمہ و تفسیر کے میدان میں خواتین کی خدمات کا تذکرہ کیا ہے اور موجودہ دور کی چند اہم سیرت نگار خواتین اور ان کی تصانیف کا بھی ذکر خیر کیا ہے۔

تیسرے باب میں ندوی صاحب نے خواتین کی سرگرمیوں کا دائرہ کار واضح کیا ہے اور بتایا ہے کہ ان کا اولین مرکز توجّہ ان کا گھر ہونا چاہیے اور ساتھ ہی ساتھ ان کی دینی ذمہ داریاں جیسے خود دین کا علم حاصل کرنا، اس پر خود عمل کرنا اور حسب استطاعت اپنے قریبی رشتہ داروں، اہل

خاندان، پڑوسیوں، دیگر متعلقین اور عام افراد تک دین کی تعلیمات پہنچانے کی کوشش کرنا جیسے امور کا تذکرہ کیا گیا ہے جن کے ذریعے گھروں کا ماحول دینی بنایا جا سکتا ہے۔ سماج کی اصلاح اور تعمیر کے بابت خواتین کی ذمہ داری کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ باب چہارم میں چند ایسے مسائل پر گفتگو کی گئی ہے جو عصر حاضر میں خواتین اسلام کو درپیش ہیں مثلاً قرآن و حدیث سے حجاب کے احکام، جن کی فرضیت اور ضرورت کو ثابت کیا گیا ہے اور بعض اعتراضات کے جوابات دیے گئے ہیں اور ہندوستان میں حجاب پر پابندی کے مسئلے کا جائزہ بھی لیا ہے۔ ندوی صاحب نے حدیث و آثار صحابہ رضی اللہ عنہم سے ثابت کیا ہے کہ خواتین کو مساجد میں جانے کا پورا حق ہے اور اس سلسلے میں چند اشکالات کی کچھ توضیحات بھی کی ہیں۔ مزید مساجد اور دوسرے مقامات پر خواتین کی تعلیم وتربیت کی بابت مختلف تدابیر اختیار کرنے کی تلقین بھی کی ہے۔ اس کے بعد خواتین کی دینی سرگرمیوں، مخلوط مجلسوں، نامحرموں سے ملاقات، اعلیٰ تعلیم کے حصول اور خلوت کے حدود وآداب کا ذکر کیا ہے اور مخلوط مجلسوں اور مشترک مجلسوں میں فرق واضح کیا ہے۔ یہ بھی بحث کی گئی ہے کہ کیا عورت دینی و دعوتی سرگرمیوں، حج، عیادت اور تعزیت کے لیے گھر سے باہر نکل سکتی ہے؟ اور ملازمت پیشہ خواتین کے مسائل کیا ہیں؟

آخری باب میں خواتین کے متعلق اکتیس کتابوں کا تعارف بھی ہے جو آسان الفاظ میں پیش کیا گیا ہے چند کتابوں کے نام یوں ہیں: عورت: اسلامی معاشرے میں، اسلام کا عائلی نظام، اسلام میں عورت کی حیثیت، زوجین کے حقوق اور ذمہ داریاں، عورت، خاندان اور سماج، قرآن مجید کی عائلی تعلیمات، قرآنی خواتین، خواتین اور خدمت قرآن، نظرات فی کتاب اللہ، محدثات اور مساجد میں خواتین کی آمد وغیرہ۔ واضح رہے یہ کتاب قرآن، حدیث، آثار صحابہ رضی اللہ عنہم اور تاریخی شواہد کی روشنی میں لکھی گئی ہے۔

۷۔ خواتین میں اسلامی تحریک

سید سعادت اللہ حسینی کی یہ کتاب اپنے موضوع پر متفرق مگر بہت ہی فکر انگیز اور قیمتی مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس کتاب کو ہدایت پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرس، نئی دہلی نے ۲۰۰۶ میں شائع کیا ہے۔ "یہ کتاب خواتین کو سماج میں ان کا حقیقی مقام دلانے کے مشن کا حصہ ہے۔ بتایا گیا ہے کہ وہ مقام کیا ہے؟ جو اللہ رب العزت نے خواتین کے لیے اوّل روز سے طے کر دیا تھا اور جس مقام پر

عہد نبوی کی مسلم خواتین پوری اسلامی شان کے ساتھ فائز نظر آتی ہیں۔ جہاں خواتین کے لیے سب کچھ ہے، حقوق بھی ہیں اور تحفظ بھی، احترام بھی ہے اور آزادی بھی، مجبوریوں کالحاظ بھی ہے، اور بھرپور مواقع بھی" (اشارہ کتاب، ص:۷)۔

مصنف نے نظام خاندان کے متعلق جدید مغربی نظریات اور مغربی و مشرقی معاشروں میں ان کے برے نتائج کا تنقیدی جائزہ لے کر ثابت کیا ہے کہ خاندان اور عورت کے نسوانی وجود کی آخری پناہ گاہ، اسلام ہی ہے۔ ہندوستان کی مسلم سوسائٹی میں عورت کی ناگفتہ حالت پر نقد و تبصرہ کرتے ہوئے کہا گیا کہ ہندوستان میں اسلام پسند خواتین ایک عملی اسلامی نسائی تحریک چلانے کی کوشش کریں جو عورتوں کو ان کے جائز حقوق دلا دے، انہیں اپنے حقوق کے حصول کے لیے کھڑا کرے اور توہمات، غیر اسلامی روایات اور استحصالی رویوں کے خلاف مہم چلائے۔ اسلام میں ویمن امپاورمنٹ کے تصور کی وضاحت کرتے ہوئے جدید تصور سے اس کے اختلاف کو اجاگر کیا گیا ہے۔ اس کے بعد ہندوستان میں مسلم خواتین کی عدم فعالیت پر بحث کرتے ہوئے کہا گیا کہ مسلم خواتین ملک کے زندہ اور سلگتے مسائل میں دلچسپی لیں، ان کے حل کی سنجیدہ کوشش کریں، اس مقصد کے لیے تحریکیں چلائیں اور سوسائٹی کو نیا رنگ اور نئی شکل دینے میں اپنا رول ادا کریں۔ علاوہ ازیں، خواتین کی کچھ عالمی اسلامی تحریکات پر گفتگو بھی ہے اور سوڈان، ایران اور ملیشیا میں ان تحریکات کے سرگرم اور فعال رول پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

سعادت صاحب نے ہندوستان میں خواتین کی سماجی فعالیت پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے ہندوستانی مسلم خواتین کو یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ اگر وہ حوصلہ، ہمت اور سرگرمی سے کام لیں تو گراں قدر خدمات انجام دے سکتی ہیں۔ اسی طرح جہیز، ستی، نابرابری، کم تر سلوک، گھریلو جارحیت، دختر کشی، عریانت، جنسی استحصال اور جسم فروشی پر بحث کی گئی ہے اور ساتھ ہی ساتھ اسلام پسند خواتین سے اپیل کی ہے کہ وہ ان مسائل کو ملک گیر سطح پر اٹھائے کیونکہ انہی کے پاس ان مسائل کا حل موجود ہے اسلامی تعلیمات کی صورت میں۔ مزید بر آں سرمایہ دارانہ استعمار جس طرح خواتین کے استحصال، ان پر طرح طرح کے مظالم، کام کا بھاری بوجھ اور جسم اور حسن کو فروخت کرتا ہے اس کا بھی ذکر ہے۔

آخر میں مغربی تہذیبی یلغار کے مختلف گوشوں کا جائزہ لے کر اس سے رونما ہونے والی تباہی

پر مفصل بحث کی گئی ہے اور اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ مغربی کے مقابلے میں مسلم خواتین ایک متبادل اسلامی طرزِ حیات کی علمبردار بن کر اٹھیں اور سادگی، جفاکشی، فطرت سے ہم آہنگی اور طبقاتیت کے مقابلے میں انسان دوستی اور سود کے مقابلے میں سخاوت وغیرہ قدروں کے فروغ کے لیے باقاعدہ تحریکیں چلائیں۔ کتاب میں اسلام اور مغرب کے تہذیبی تصورات اور مغربی تہذیبی یلغار سے نجات پانے کی تدابیر پر بھی بحث کی گئی ہے۔ اسلام میں عورت کی امامت کے مسئلے پر بھی اظہار خیال ہے۔ نیز اسلام میں صنفی رول، نکاح کے اصول و قوانین اور قانون طلاق اور تعدد ازدواج میں صنفی عدل کی وضاحت کی ہے۔ مصنف نے ہندوستان میں مسلمان خواتین کی ناخواندگی کا جائزہ بھی لیا ہے، ایک جگہ نسل نو کی تعمیر میں ماں کے رول پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور ہندوستان میں مسلم طالبات کی تحریک کی اہمیت اور اس کی ضروریات پر مفصل بحث کی ہے۔

۸۔ عورت اور اسلام

اس کتاب کے مصنف سید جلال الدین عمری ہیں جنھوں نے خواتین کے بارے میں اور بھی کئی کتابیں لکھی ہیں جن میں "عورت اسلامی معاشرے میں"، "مسلمان عورت کے حقوق اور ان پر اعتراضات کا جائزہ"، "اسلام کا عائلی نظام اور مسلمان عورت کی ذمہ داریاں" قابل ذکر ہیں۔ زیر نظر کتاب پہلی مرتبہ ۱۹۷۹ء میں اس وقت شائع ہوئی جب بین الاقوامی سطح پر خواتین کا سال منایا گیا تھا اس کو مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی نے شائع کیا ہے۔ یہ کتاب چھ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں اسلام میں عورت کی عظمت، خاندان کی تعمیر میں اس کے کردار، اس کا حقیقی میدان عمل اور اس میدان عمل کے تعلق سے بعض اعتراضات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ دوسرے باب میں عورت کا بطور ماں، بیوی، بیٹی اور بہن قرآن و حدیث کی روشنی میں جائزہ لیا گیا ہے۔ مصنف کا کہنا ہے کہ "اسلام نے عورت کو تمام حیثیتوں سے اتنا برتر اور اونچا مقام عطا کیا ہے کہ اسلام کے حدود میں رہتے ہوئے کوئی اس سے اس کا یہ مقام رفیع چھین نہیں سکتا" (ص:۲۳)۔

تیسرے اور چوتھے باب میں دور اول کی خواتین کے نقوش تاباں مثلاً ایمان، دین پر استقامت، ذوق عبادت، نماز کا اہتمام، نماز باجماعت میں شرکت، علم و فضل، ذکر و تسبیح، کثرت عبادت، روزوں کا شوق، جذبہ انفاق اور حج و عمرہ کو نمایاں کیا گیا ہے۔ اگلے باب میں بتایا گیا کہ صدر اول کی خواتین نے معاشرے سے بے تعلقی اختیار نہیں کی تھی بلکہ انھوں نے دعوت و تبلیغ، معاشرتی تعلقات اور معاشرتی و سماجی و معاشی خدمات میں اہم کردار ادا کیا اور اقامت دین کی

کوششوں میں بھی حصہ لیا ہے۔ آخری باب میں خاندان میں مرد و عورت کی ذمہ داریوں اور پھر مسلم خواتین کی ملازمت کے متعلق مختلف سوالات کے جوابات ہیں۔

۹۔ عورت عہد رسالت میں

استاد عبد الحلیم ابو شقہ نے عربی میں ایک قیمتی کتاب بعنوان ''تحریر المراۃ فی عصر الرسالۃ'' تصنیف کی تھی جس کا اردو ترجمہ محمد فہیم اختر ندوی صاحب نے بعنوان ''عورت عہد رسالت میں'' کیا اور قاضی پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز، نئی دہلی نے ۱۹۹۹ میں شائع کیا۔ اس کتاب کے بارے میں مصنف نے لکھا کہ ''کتاب میں پوری وضاحت کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ عہد رسالت صلی اللہ علیہ وسلم میں عورت کس طرح نعمت آزادی سے سرفراز کی گئی۔ اس فقہی اور سماجی مطالعہ کا مقصد بھی یہی ہے کہ اس اولین آزادی کی راہ پر چلتے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ اپناتے ہوئے موجودہ مسلم خاتون کو دوبارہ آزادی دلانے میں کچھ حصہ مل سکے'' (مقدمہ کتاب، ص:۵۴)۔

یہ اپنے موضوع پر ایک مستند اور معتدل کتاب ہے جو خواتین اسلام کے تمام گوشوں کا احاطہ کرتی ہیں مثلاً قرآن و سنت کی روشنی میں مسلم خواتین کی شخصیت، مقام، لباس، زیب و زینت، خاندان اور سماج میں رول، مردوں سے ملاقات اور سماجی اور سیاسی زندگی میں شرکت۔ اس کتاب کے بارے میں علامہ یوسف القرضاوی لکھتے ہیں ''ہمارے سامنے ٹھوس علمی تحقیق ہے اور مستند دلائل سے آراستہ ہے۔ مستند اور معتبر سرچشموں سے ماخوذ ہے اور مصنف نے اپنی محنت و کاوش، فکر و نظر، اور علم و تجربہ کا نتیجہ اس پختہ معیار پر ہمارے سامنے رکھ دیا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ زیر نظر کتاب ایک انسائیکلوپیڈیا ہے، جس میں مسلم خاتون کی زندگی کے تمام گوشوں کا احاطہ کر لیا گیا ہے۔ خاتون مسلم کی شخصیت و مرتبہ، لباس، زیب و زینت، خاندان اور سماج میں رول، مردوں سے ملاقات، سماجی اور سیاسی زندگی میں شرکت، ان تمام پہلوؤں پر قرآن کریم، سنت رسول ﷺ اور سلف صالحینؒ کے فہم کی روشنی میں تفصیل آگئی ہے'' (مقدمہ و تعارف کتاب از علامہ یوسف القرضاوی، ص:۳۰-۳۱)۔

یہ کتاب چھ ابواب پر مشتمل ہے، پہلے باب میں فاضل مصنف نے نسوانی شخصیت کے خدوخال، مختلف پروگراموں اور عبادت میں عورت کی شرکت اور اسلام میں عورتوں کے حقوق و فرائض پر قرآن و حدیث کی روشنی میں تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ مزید برآں، مصنف صاحب نے عورتوں کے بارے میں چند صحیح احادیث، جن سے بظاہر عورتوں کا مقام و مرتبہ مجروح ہوتا ہے

اور جن کی غلط تاویل بھی کی جاتی ہے، کا جائزہ لیا ہے اور ان کے صحیح اور معتدل مفاہیم بیان کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ دوسرے اور تیسرے باب میں فاضل مصنف نے سماجی اور سیاسی سرگرمیوں میں مسلم خواتین کی شرکت کے واقعات، ان واقعات میں مسلم خواتین کے کردار اور بعض سماجی اسباب پر مفصل بحث کی ہے۔ اسی طرح فاضل مصنف نے حکم حجاب سے قبل مردوں کے ساتھ ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کا میل جول، دور رسالت میں عام عورتوں اور مردوں کے درمیان میل جول مثلاً حصول علم میں، محفل زفاف میں، شادی کے ولیمے میں، سلام وجواب میں، زیارت میں، مسجد میں، جہاد میں، حج میں، شوہر کے انتخاب میں، مریضوں کی عیادت میں، وغیرہ پر روشنی ڈالی ہے اور ساتھ ہی ساتھ سماجی زندگی میں عورتوں کی شرکت اور مردوں سے میل جول پر معترضین کے اقوال، دلائل اور اعتراضات کا جائزہ بھی لیا ہے اور ان کے حکمت پر مبنی جوابات بھی دیے ہیں۔ اس کے علاوہ ان دو ابواب میں مسلم خواتین کی ملازمت کے بعض جدید سماجی اسباب، اس کے متعلق شرعی ہدایات اور مرد و عورت کے درمیان میل جول کے آداب کو واضح کیا گیا ہے اور حجاب کے مفہوم، آیت حجاب کے نزول کی تاریخ اور ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے ساتھ اس کی مخصوصیت کے دلائل کو بیان کیا گیا ہے۔

چوتھے باب کی پہلی فصل میں فاضل مصنف نے لباس کے شرعی مقاصد اور اجنبی مردوں سے ملاقات کے وقت عورت کے لباس کے شرائط پر روشنی ڈالی ہے۔ اسی باب کی دوسری اور تیسری فصل میں فاضل مصنف نے اس بات کو قرآن و حدیث سے ثابت کیا ہے کہ عہد رسالت صلی اللہ علیہ وسلم میں خواتین عموماً برہنہ چہرہ رہتی تھیں اور ساتھ ہی ساتھ برہنہ چہرے کے جواز پر فقہائے متقدمین کی آراء پر بحث کی گئی ہے۔ اسی طرح چوتھی اور پانچویں فصل میں لباس کے حدود اور چہرہ، ہتھیلیوں، پاؤں اور کپڑوں کی زینت میں اعتدال پر گفتگو کی گئی ہے۔ پانچویں باب میں فاضل مصنف نے اسلام میں شادی کا تصور اور اس کے امور و مسائل، پیغام نکاح اور اس کے امور و مسائل، مہر اور اس کے امور و مسائل، شوہر اور بیوی کے یکساں حقوق، جزوی حقوق اور ذمہ داریوں، طلاق اور خلع کے آداب اور مصلحت، مباشرت کے آداب اور تعدد ازدواج کے آداب، اسباب اور شرائط پر مفصل گفتگو کی ہے۔ آخری باب میں فاضل مصنف نے جنسی لطف اندوزی کی شرعی اجازت، حدود اور آداب پر روشنی ڈالی ہے اور ساتھ ہی ساتھ حرام لطف اندوزی سے بچنے کی تعلیم اور جنسی امور سے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا تذکرہ بھی کیا ہے۔

بیسویں صدی کے اردو سفر ناموں کا مطالعہ

سراج انور محمد میران
ریسرچ اسکالر، SRTMU، ناندیڑ، مہاراشٹر
sirajanwar98@gmail.com

سفر انسانی زندگی کی ناگزیر حقیقت ہے اسے وسیلۂ ظفر بھی کہا جاتا ہے۔ سفر متعدد مقاصد مثلاً کبھی تجارتی اور معاشی ضرورت کے لئے کیا جاتا ہے تو کبھی اسے حصول علم اور ترویج علم کے لئے وسیلہ بنایا جاتا ہے۔ یہ نئے علاقوں اور خطوں کی دریافت کا بھی ذریعہ ہے۔

سفر انسان کو مذہبی عبادات اور عقیدت کے اظہار کا موقع بھی فراہم کرتا ہے۔ یہ دعوت دین اور تبلیغ مذہب کا وسیلہ بھی ہے۔ اس سے انسان دوستی اور اخوت کے پیغام کو مستحکم کرنے میں مدد ملتی ہے۔ آج کے دور میں مقامی، ملکی اور عالمی صورت حال سے آگاہ ہونے اور باہمی روابط قائم کرنے کے لئے بھی سفر کو بنیاد بنایا جاتا ہے۔ سفر کی روداد کو محفوظ کرنے کے تاریخ کے دور قدیم سے ہی شواہد ملتے ہیں۔ سفر کی اہمیت اور افادیت کا اندازہ مولانا ابوالکلام آزاد کی ایک تحریر کے اس اقتباس سے لگایا جاسکتا ہے:

> میں نے آدھا علم سفر سے حاصل کیا ہے۔ مطالعہ کی تنہائیوں نے مجھے ذہنی بالیدگی بخشی لیکن سفر کے مشاہدوں نے میری نگاہ کو وسعت دی۔ جو لوگ سفر نہیں کرتے وہ بسم اللہ کے گنبد میں رہتے ہیں۔ سفر انسان کو قوموں کی سرگزشت اور ملکوں کی تاریخ کا بالواسطہ بخشتا ہے جس طرح سائنس کے معلموں میں حقائق اشیاء کا ادراک ہوتا ہے اسی طرح سفر سے صفات انسانی کی حقیقوں کا علم ہوتا ہے اور مختلف اقوام کے امزجہ وطبائع کا پتہ چلتا ہے۔[1]

مختلف آرا کا مطالعہ کرنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ سفر نامہ ایک بیانیہ صنف ہے۔ سفر نامے میں تہذیبی، سماجی، مذہبی، تاریخی اور فکری عناصر کے مطالعے کے لئے سفر نامے

---

[1] آج کل اور اردو سفر نامہ، مرتبہ محبوب الرحمٰن، ڈاکٹر ابرار رحمانی، پبلی کیشنز ڈویژن وزارتِ اطلاعات و نشریات حکومتِ ہند، ۲۰۰۰، پیش لفظ، ص ا

کے درون میں اتر کر یہ معلوم کرنا ہوتا ہے کہ سیاح کو کن مرحلوں اور کن راہوں سے گزرنا پڑتا ہے کہ وہ اپنے گردوپیش کے منظر کو کن مختلف جہتوں سے دیکھتا اور پرکھتا ہے اور محسوس کرتا ہے۔

سفر ناموں کو تاریخ کے طور پر تسلیم نہیں کیا جاتا کیونکہ تاریخ میں حقائق سے بحث ہوتی ہے اور اس میں حکومتوں کے عروج و زوال کے بیان پر زور دیا جاتا ہے۔ واقعے کے رونما ہونے کے سنہ وسال کا تعین کیا جاتا ہے جس میں مؤرخ عموماً ذہنی یا جذباتی لگاؤ کا اظہار نہیں کرتا بلکہ وہ پیش کرتا ہے جو ایک مؤرخ کا فرض ہوتا ہے۔ جب کہ سیاح اپنے ایسے حالات و واقعات کو بھی پیش کر دیتا ہے جس پر قاری کا ذہن یقین کرنے پر آمادہ نہ ہو لیکن یہ بھی سچائی ہے کہ ایک مؤرخ دربار سے وابستہ ہوتا ہے اور اس کی درباری وابستگی غیر جانبداری اور حقیقت پسندی کی راہ میں حائل ہو سکتی ہے۔ لیکن دنیانوردی کا شیدائی بغیر کسی مفاد کے سارے واقعات کو من وعن لکھ سکتا ہے اس کے باوجود کہا جاسکتا ہے کہ سفر نامے کلیۃً درست بھی نہیں۔ بعض سفر نامے ایسے بھی ہیں جو سیاح اور مورخ کی بہ یک وقت تصویر بن جاتے ہیں۔ ان سفر ناموں میں تاریخی حالات و واقعات کے ساتھ سیاح کے زمانے کے تہذیبی، جغرافیائی اور مذہبی معلومات بھی ہوتی ہیں۔ مثلاً حکیم ناصر خسرو کا سفر نامہ زادالمسافرین ہے جو سنہ ۴۳۷ھ میں لکھا گیا۔ اس کا اردو ترجمہ ''سفر نامہ حکیم خسرو'' کے نام سے مولوی عبدالرزاق کانپوری نے ۱۹۴۱ء میں کیا۔ خسرو کا یہ سفر نامہ تاریخی اور تہذیبی اعتبار سے اپنی منفرد شناخت رکھتا ہے۔ اور ایسی حقیقتوں کو پیش کرتا ہے جن سے تاریخ کی اوراق سازی ہوتی ہے، اوراس کی معنویت وافادیت میں اضافہ کرتی ہے۔ اس سفر نامے میں مختلف شہروں، قصبوں اور بستیوں کا جغرافیائی محل وقوع، فرمانروائے وقت، حکماء، علماء، صوفیاء اور شعراء کا ان سے مختصر ملاقات کے ساتھ ذکر، گورنمنٹ کا طرز حکومت، عدلیہ کا طریقۂ انصاف اور دیگر محکموں کی تصویر کشی، قدیم عمارتوں کے آثار واحوال، مساجد، گرجاگھر، خانقاہیں، زیارت گاہیں، مقابر، مدارس اور محلات و قلعے وغیرہ کے حالات، مصنوعات ملکی، درآمد اور برآمد کے اصول و نظام، کپڑے، نرخ اور سکّوں وغیرہ کی قیمتوں کا دوسرے ملکوں سے موازنہ، مناظر قدرت اور سیر گاہوں کا ذکر، فوجی چھاؤنی اور ان کے انتظامات، بازاروں کے عام حالات اور دوکانداروں کا طرز گفتگو، زراعت اور کاشتکاری کی تفصیلات، ایک مقام سے دوسرے مقام تک کا فاصلہ، جنگلی حیوانات اور عجائبات کائنات، حوادث عالم، زلزلے اور طلسمات، سمندر، نہریں، چشمے اور بندر گاہوں کا ذکر،

مردم شماری، قوموں کے خصائص، ملکی اور شہری رسم و رواج، قومی میلے اور جشن وغیرہ کا ذکر، ملکی دولت اور افلاس، یہاں تک کہ روزمرہ کے استعمال میں آنے والے ظروف تک کا ذکر ملتا ہے۔ حکیم ناصر خسرو نے اپنے سفر نامے میں جس جگہ کا سفر کیا ہے وہاں کے بارے میں تفصیل کے ساتھ جزئیات نگاری کی ہے۔ تاریخی اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو ان کا یہ سفر نامہ حقیقت حال کی متحرک تصویر پیش کرتا ہے، جس میں ان کے عہد کے مختلف مقامات جیتے جاگتے نظر آتے ہیں۔ وہ مصر کے شہر قاہرہ کے بارے میں تاریخی سماجی، تہذیبی اور معاشرتی حالات کی عکاسی یوں کرتے ہیں:

> قاہرہ کے پانچ دروازے ہیں: باب النصر، باب الفتوح، باب القنطرہ، باب الزویلہ، باب الخلیج۔ قاہرہ میں فصیل نہیں ہے لیکن عمارتیں ایسی اونچی ہیں جو فصیل سے کہیں زیادہ مضبوط اور بلند ہیں۔ ہر مکان اور محل ایک قلعہ کا درجہ رکھتا ہے۔ اکثر عمارتیں پنج منزلہ اور چھ منزلہ ہیں۔ دریائے نیل کا پانی پیا جاتا ہے۔ بھشتی اونٹوں پر پانی لے جاتے ہیں۔ جو کنویں نیل سے قریب ہیں ان کا پانی میٹھا ہوتا ہے اور جو دور ہیں وہ کھاری ہیں۔ مصر و قاہرہ میں پچاس ہزار اونٹ ہیں جو آب کشی کرتے ہیں اور انہیں کے ذریعے بھشتی پانی لاتے ہیں۔ شہر میں مکانوں کے اندر باغ اور چمن ہیں جن کی آبپاشی کنوؤں سے ہوتی ہے۔[۲]

متذکرہ بالا اقتباس سے اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حکیم ناصر خسرو کی ژرف نگاہی کا کیا عالم ہے۔ یقیناً اس مختصر سے اقتباس کے ذریعے انہوں نے قاہرہ کے بارے میں بہت کچھ بتا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے سفر نامے کو تاریخی حیثیت و اہمیت حاصل ہے۔ اسی طرح حکیم ناصر جہاں جہاں جاتے ہیں وہاں کے جزئی اور کلی حالات کو اپنے سفر نامے میں پیش کرنے کی کوشش کرتے۔ ممکن ہے بہت سے لوگوں کا یہ بھی خیال ہو کہ ان کا سفر نامہ محض ماضی کے حالات کی تاریخ ہے۔ لیکن ایسا اس لئے نہیں ہے کہ انہوں نے صرف دریائے نیل کی طغیانی اور وہاں کے مقبروں کا ذکر ہی کیا ہے بلکہ انہوں نے وہاں کی چلتی پھرتی زندگی سے وابستہ مسائل اور کوائف کو بھی پیش کیا ہے۔ اگرچہ تاریخی وقوعے کی ترتیب میں فرق ممکن ہے مگر ان کے عہد کی تاریخ و تہذیب اور معاشرتی زندگی کی تصویر میں کوئی فرق نہیں آتا اور یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے

[۲] احتشام حسین ذکر و فکر، علی احمد فاطمی، رجحان پبلیکیشنز، کریلی کالونی، الہ آباد، جنوری ۲۰۱۳ء، ص ۹۲۔

کہ پانچویں صدی ہجری کے مصرو قاہرہ اور دیگر شہروں اور ملکوں کے حالات جہاں جہاں کا انہوں نے سفر کیا ہے اگر لکھے جائیں تو ان کے سفر نامے کو حوالے کے طور پر استعمال کیا جائے گا جو اس عہد کی تاریخ کی توثیق کرے گا۔ اس میں شک نہیں کہ حکیم ناصر خسرو نے اپنے سفر نامے میں سنہ اور تاریخ پر زیادہ زور نہ دیتے ہوئے حقائق کی تصویر کشی پر زیادہ عرق ریزی کی ہے اور چھوٹے سے چھوٹے واقعے کو تہذیب اور تاریخ کا حصہ بنا کر اپنے سفر نامے میں جگہ دی ہے۔ وہی جزئی اور چھوٹے چھوٹے واقعات وحادثات اور منظر نگاری آج کے عہد میں تاریخ کا اہم حصہ بن گئے ہیں۔ لہٰذا قدیم سفر ناموں کی اہمیت وافادیت لکھی ہوئی تاریخ سے زیادہ معتبر تسلیم کی جاسکتی ہے۔ بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ انہیں قدیم سفر ناموں کے ذریعے قدیم تاریخ کی ترتیب اور توسیع ہوتی ہے اور انہیں سفر ناموں میں قدیم تاریخی حقیقتوں کے رموز و نکات کی تلاش کی جاتی ہے۔

اکثر و بیشتر سیاح کسی ملک یا قوم کی تاریخی حقیقت کو معلوم کرنے کی غرض سے سفر نہیں کرتے بلکہ ان کی سیاحت کے مختلف مقاصد ہوتے ہیں۔ وہ انہیں مقاصد کے پیش نظر اپنے سفر کا سلسلہ جاری رکھتے ہیں اور مختلف شہروں اور ملکوں کے تاریخی حالات کے بارے میں بہت زیادہ تحقیق سے کام نہیں لیتے بلکہ وہ جس چیز کو دیکھتے ہیں یا جس جگہ کے بارے میں روایتیں سنتے ہیں ان کو اپنے سفر نامے کا حصہ بنا لیتے ہیں۔

فاہیان (م: ۴۲۲ء) کے سفر نامے کو تاریخی حیثیت حاصل ہے اور بیشتر مؤرخوں نے اس کے سفر نامے سے گراں قدر معلومات حاصل کی ہیں۔ ہندوستان کی سرزمین قدیم زمانے سے مختلف ملکوں کے سیاحوں کے لیے مرکز توجہ بنی ہوئی تھی۔ یہاں پر قدیم مقامات کی تلاش میں اور قدیم مذہبوں کی بنیاد و اساس کی جستجو میں دوسرے ممالک کے سیاح آتے رہے۔ انھیں سیاحوں کے سیاحت ناموں میں آج قدیم ہندوستان کی تاریخ دیکھی جاسکتی ہے۔

غیر ملکی سیاحوں میں سے ایک اور چینی سیاح ہیون سانگ (م: ۶۶۴ء) بھی ہے۔ جس کے سفر نامے کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ہندوستان میں اس کے سفر کی مدت ۶۳۰ء سے ۶۴۵ء تک ہے۔ اپنے پندرہ سالہ سفر کی داستان کو اس نے بڑی آزادی کے ساتھ لکھا ہے۔ اس نے اس زمانے کے راجہ ہرش وردھن کے حکومتی نظام، رعایا کی خوش حالی اور ان کے علم وادب سے دوستی وغیرہ کا خوبصورت نقشہ کھینچا ہے۔ یہ چینی سیاح بھی مذہبی مقامات کی تلاش اور حق کی جستجو میں نکلا تھا۔

اس نے بہت سے مقامات کا سفر کیا اور مختلف مذاہب کے بارے میں معلومات بھی حاصل کیں۔ اس کے سفر نامے میں ساتویں صدی عیسوی کے ہندوستان کی تاریخ، مختلف واقعات، مذہبی رجحانات وامکانات، رسوم ورواج اور توہمات پرستی وغیرہ صاف طور پر نظر آتے ہیں۔

میگستھنیز(م: ۲۹۰ء) فاہیان اور ہیون سانگ کے بعد ہندوستان آنے والے بہت سے سیاح گذرے لیکن کافی زمانے تک کوئی ایسا تاریخ ساز سیاح نظر نہیں آتا جس کے سفر نامے کی اہمیت کو با قاعدہ طور پر تسلیم کیا جائے۔ چونکہ فاہیان نے جب ہندوستان کا سفر کیا تو اس کا مطمح نظر اپنے مذہب کی حقانیت کو تلاش کرنا تھا۔ اس لئے وہ اسی کے احوال و آثار کو محفوظ کرنے میں تگ و دو کرتا رہا۔ اس کے سفر نامے میں اس خاص مقصد کی جھلک دکھائی دیتی ہے اور ہندوستان کی تہذیب و تاریخ کا عنصر کم نظر آتا ہے۔ اس لیے اس کے سفر نامے کی وہ اہمیت نہیں ہے جو میگستھنیز کے سفر نامے کی ہے۔ اس کے بعد ہیون سانگ کے سفر نامے پر بھی مذہبی عناصر غالب نظر آتے ہیں۔ بعد کے آنے والے سیاحوں میں ابوریحان البیرونی (م:۱۰۴۸ء) اور محمد ابو عبد اللہ ابن بطوطہ (م:۱۳۶۹ء) وغیرہ دکھائی دیتے ہیں جن کے سفر ناموں کی شناخت سفر نامے سے کم اور تاریخ کی حیثیت سے زیادہ ہے۔ البیرونی کی کتاب ''کتاب الہند'' میں ہندوستان کی تہذیبی، سماجی، مذہبی اور جغرافیائی تاریخ بڑی دیانتداری کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔

البیرونی نے ''کتاب الہند'' میں اہل ہند کے حالات و کوائف، ان کے عقائد و نظریات، رسوم ورواج اور ان کی سماجی اور معاشرتی زندگی کی غیر متعصبانہ تصویر کشی کی ہے۔ حالانکہ البیرونی نے اپنے عہد کے ہندوستان کی سچی تصویر پیش کی ہے، البتہ وہ بعض مقامات پر اپنے نظریات وعقائد کا اظہار بھی کر دیتا ہے لیکن ایسا اس وقت ہوتا ہے جب اس کے سامنے دوسرے مذہب کے ماننے والے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔

البیرونی صرف ایک قابل سیاح کی صورت میں ہی اپنی شناخت نہیں رکھتا بلکہ وہ اپنی علمی استعداد وصلاحیت اور فنی مہارت سے بھی پہچانا جاتا ہے۔ ۴۰۸ھ سے ۴۲۳ھ کو محیط اس کا ہندوستانی سفر نامہ ''کتاب الہند'' بڑی بڑی مہموں اور عجیب وغریب واقعات و حادثات اور مشاہدات و تجربات سے پُر ہے۔ اس نے ہندوستان میں قیام کے دوران سنسکرت زبان و ادب پر مہارت حاصل کی اور کچھ ہی سالوں میں ہندو مذہب کی بنیادی کتابوں کا مطالعہ کر لیا جس کے

ذریعے ہند کے مذہبی فلسفے اور یہاں کے علم ہیئت، علم نجوم اور ریاضیات جیسے مشکل موضوعات کو سمجھ کر اہل ہند کے درمیان خاص مقام حاصل کر لیا۔

البیرونی کے سفر نامے میں ہندوستان کے مختلف شہروں کی تاریخ اور ان کا جغرافیائی نقشہ، اہل ہند کے سماجی حالات اور ان کے مذہبی عقائد، ہندوستان میں بسنے والی مختلف قوموں اور نسلوں کے طبقاتی نظام اور ان کے امتیازات، مذہبی اصول و قوانین اور ہندوستانی پیغمبر اور ان کی شریعت کا ذکر ہے۔ ہندوستان میں بت پرستی کے سلسلے کا آغاز کب اور کیسے ہوا، وید، پران اور گیتا جیسی مقدس کتابوں کا ذکر، ہندوستانی علوم بالخصوص علم نحو و صرف علم ہیئت اور علم نجوم کے ساتھ ریاضیات اور یہاں کے دریاؤں، پہاڑوں اور صحراؤں کا تذکرہ۔

البیرونی نے اپنی اس کتاب کو تقریباً اسی ۸۰، ابواب اور مضامین پر مشتمل رکھا ہے۔ اس سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس نے کوزے میں دریا سمو دیا ہے۔

دیگر سفر نامہ نگاروں کی طرح البیرونی نے محض منظروں کا نقشہ نہیں کھینچا ہے بلکہ ان منظروں کی تہوں میں اتر کر اپنے جذبات و خیالات کا اظہار بھی کیا ہے جس کی وجہ سے اس کے سفر نامے میں دلچسپی پیدا ہو گئی ہے۔ ہندوستانی زبان و ادب پر اس نے کیسے عبور حاصل کیا اور کس طرح اس نے یہاں کے دیگر علوم و فنون کے بارے میں معلومات حاصل کیں، اس کے بارے میں جاننا بھی ضروری ہے تاکہ اس عہد کے ہندوستان کی معاشرتی اور سماجی تاریخ کا علم ہو سکے۔ یہ بات عام ہے کہ دسویں اور گیارہویں صدی عیسوی تک اور اس کے بعد بھی ہندوستان کے سادھو، سنت اور پنڈت یہاں کے تہذیب و ثقافت کے علاوہ دوسرے ملکوں کے بارے میں یا تو بالکل ناواقف تھے یا بہت کم جانتے تھے۔ وہ صرف اپنے ملک کی تہذیب اور علوم و فنون کو ہی سب کچھ سمجھتے تھے اور کسی دوسرے تک اپنے علم و فن کو منتقل بھی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ لیکن البیرونی نے انھیں پنڈتوں سے بھیس بدل کر سب سے پہلے سنسکرت زبان سیکھی۔ اس زبان کو سیکھنے میں جو اس کا مقصد پوشیدہ تھا وہ صرف یہ تھا کہ جس زبان میں زیادہ علمی خزانے موجود ہیں ان کو حاصل کیا جائے لہٰذا اس نے ہندوستانی پنڈتوں سے تعلقات استوار کرنا شروع کیے اور ان کے ذریعے سنسکرت زبان و ادب پر مہارت تامہ حاصل کر لی۔ یہاں تک کہ جو ہندو پنڈت اسے اپنا شاگرد سمجھتے تھے بہت جلد ہی اسے استاد کا درجہ دینے لگے۔ اس کا بیان وہ یوں کرتا ہے:

ہندو ہیئت دانوں سے (ابتدا) میرا تعلق بوجہ اجنبی ہونے کے شاگردانہ رہا لیکن تھوڑے زمانے میں جب کچھ واقفیت ہوگئی تو میری حیثیت استاد کی ہوگئی چونکہ مجھے ہیئت اور ریاضی میں پوری مہارت تھی۔ میں انھیں خود درس دینے لگا۔ پنڈتوں کو میری معلومات سے بڑا تعجب ہوا اور حیران ہو کر پوچھنے لگے کہ تم نے کس ہندو پنڈت سے یہ معلومات حاصل کی ہے۔انھیں کسی طرح یقین نا آتا تھا کہ کوئی اجنبی ان کے ملک میں آکر ہمسری کا دعویٰ کر سکتا ہے۔[۳]

البیرونی کے علاوہ ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھنے والے سیاحوں میں ابن بطوطہ (۱۳۷۷ء) کا نام قابل ذکر ہے۔ اس نے اپنے سفر نامہ "عجائب الاسفار" میں دیگر شہروں اور ملکوں کی سیاحتی تذکرے کے ساتھ ہندوستان کے مختلف شہروں اور صوبوں کا ذکر ان کے تہذیبی، معاشرتی، تاریخی اور مذہبی حالات کے ساتھ کیا ہے۔ "عجائبات الاسفار" کا اردو ترجمہ مولانا عطاء الرحمن نے ۱۳۴۸ھ (۱۹۲۹ء) میں رحمانی پریس دہلی سے شائع کیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ سفر ناموں سے تاریخی معلومات اور انکشافات ہوتے ہیں مگر انہیں مستقل تاریخی دستاویز نہیں سمجھا جا سکتا اس لئے کہ مؤرخ اور سفر نامہ نگار میں بہت فرق ہے۔ مؤرخ کسی بھی واقعہ کو لکھنے سے پہلے اس کی تحقیق کرتا ہے اور اس میں اپنے ذاتی تاثر یا تعصب کو شامل کرنے سے پرہیز کرتا ہے جب کہ سیاح یا مسافر کسی واقعہ کو سننے کے بعد اس پر یقین کر لیتا ہے اور قاری کو اپنے بیان کئے ہوئے واقعہ سے حیرت میں ڈالنا چاہتا ہے۔ یہ صرف تاریخی واقعہ کی بات نہیں ہے بلکہ وہ ہر میدان میں جلد بازی کرتا ہے۔ بقول شبلی نعمانی "سفر نامہ میں بالعموم جزئیات سے کلیات قائم کر لی جاتی ہیں[۴]"۔ ظاہر سی بات ہے جہاں واقعات کی گہرائی تک نہیں پہنچا جائے گا وہاں پر غلطیوں کا شائبہ زیادہ ہوگا۔ لیکن قدیم سیاحوں کے یہاں تاثرات و تعصبات کا دخل نہ کے برابر ہوتا ہے کیونکہ وہ واقعات و حادثات اور مشاہدات کو بڑی خاموشی کے ساتھ لکھ دیا کرتے تھے۔ ان کے سفر ناموں میں ان کے ذاتی جذبات و احساسات کم نظر آتے ہیں۔

سفر نامے میں صرف تاریخی عناصر نہیں ہوتے بلکہ اس میں تہذیبی، مذہبی اور سماجی عناصر کا بھی وجود ہوتا ہے، اس لئے تہذیب و معاشرت کا فرق اور دیگر ممالک و مقامات کے سماجی اور ثقافتی حالات کا علم ہمیں سفر ناموں کے ذریعے سے ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ اس لئے ہمیں سفر ناموں میں

[۳] اردو ادب میں سفر نامہ، ڈاکٹر انور سدید، ایم - آر - پبلی کیشنز نئی دہلی، ۲۰۱۲ء، ص۷۹۔
[۴] اردو ادب میں سفر نامہ، ڈاکٹر انور سدید، ایم - آر - پبلی کیشنز نئی دہلی، ۲۰۱۲ء، ص ۵۲۔

ان جہات کو تلاش کرنا ضروری ہے تاکہ سفر کے احوال کے ساتھ سماجی، تہذیبی اور مذہبی معلومات مل سکیں۔

جب بھی کوئی سیاح سفر کرتا ہے تو وہ جس مقام یا ملک کا سفر کر رہا ہے وہاں کے تہذیبی، سماجی، تاریخی اور جغرافیائی حالات کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اور اپنے سفر نامے میں ان کو پیش کرتا ہے۔ قدیم سیاحوں کے یہاں یہ سارے عناصر بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ عجائبات فرنگ، میں جسے اردو سفر ناموں میں نثر کے حوالے سے اولیت حاصل ہے، کافی حد تک تاریخی، جغرافیائی، تہذیبی، سماجی اور مذہبی زندگی سے جڑے ہوئے حالات و واقعات کی عکاسی صاف نظر آتی ہے۔

سفر ناموں میں جہاں تاریخی، جغرافیائی، تہذیبی اور سماجی عناصر ملتے ہیں وہیں مذہبی عناصر بھی صاف نظر آتے ہیں چونکہ جب کوئی سفر نامہ نگار حالات سفر قلمبند کرتا ہے تو ان سارے حالات و واقعات کو پیش کرنا چاہتا ہے جو اس کے سامنے رونما ہوئے، چاہے وہ تہذیبی، معاشرتی یا مذہبی ہوں، سفر نامہ نگار ان کو اپنے سفر نامے میں پیش کر کے قارئین تک پہنچانا چاہتا ہے۔ علامہ شبلی نعمانی کے سفر نامے کا ایک اور اقتباس جس میں قسطنطنیہ کے محرم اور وہاں کی مجلس و ماتم کو پیش کیا گیا ہے:

> اگرچہ یہ لوگ شہر کے تمام حصوں میں پھیلے ہوئے ہیں لیکن کثرت سے جہاں رہتے ہیں وہ والدہ خانہ نامی ایک محلہ ہے۔ محرم کے زمانے میں دھوم دھام کی مجلسیں اور نوحہ وبکا کا ہنگامہ زیادہ تر یہیں ہوتا ہے۔ مجلسوں میں یہاں سوز اور تحت اللفظ کا دستور نہیں، صرف حدیث خوانی ہوتی ہے۔ اور در حقیقت مجلس عزا کا مقصود بھی یہی ہے۔ عام طریقہ یہاں کا یہ ہے کہ اول منبر کے قریب ایک شخص کھڑا ہو کر زبانی جناب امیر اور حضرت امام حسین کے فضائل اور مناقب کے متعلق اشعار پڑھتا ہے۔ پھر ایک مستعد عالم منبر پر بیٹھ کر حالات کربلا کو وعظ کے طور پر نہایت خوبی اور صفائی سے بیان کرتا ہے... ماتم کے چند طریقے ہیں اور بعض نہایت عجیب اور مؤثر ہیں۔ ادنیٰ درجے کا ماتم یہ ہے کہ نہایت زور سے چھاتی پیٹتے ہیں یہاں تک کہ اس جگہ کا گوشت ابھر آتا ہے۔ دوسرا طریقہ زنجیروں سے ماتم کرنا ہے، تیس تیس چالیس چالیس آدمیوں کا حلقہ ہوتا ہے اور سینہ یا پشت پر اِس زور سے زنجیریں مارتے ہیں کہ دور تک آواز آتی ہے۔ تیسرا طریقہ

تلواروں سے ماتم کرنے کا ہے اور وہ شب شہادت کے ساتھ مخصوص ہے۔[۵]

متذکرہ بالا اقتباس سے قسطنطنیہ میں منائے جانے والے محرم اور وہاں کے ماتم کے انداز کو بخوبی بیان کیا ہے اور وہاں پائے جانے والے مذاہب کے رسم و رواج، تہذیب و ثقافت کا بھی علم حاصل کیا جاسکتا ہے۔

سفر ناموں کے ذریعے ہمیں مختلف ممالک کی سماجی زندگی اور وہاں کے اخلاق، معاشرتی اور مذہبی حالات کا علم ہوتا ہے اس لئے ہم مختلف سفر ناموں میں ان عناصر کو تلاش کرتے ہیں۔ آیئے دیکھتے ہیں محمد حسین آزاد نے اپنے روز نامچے میں ایران کے شہروں کے بارے میں کیا لکھا ہے:

> اہل ایران میں عام دستور ہے کہ ہر اشراف سفید پوش کے مکان کے ساتھ ایک مردانہ مکان ہوتا ہے وہ حرم سرا سے زیادہ آراستہ ہوتا ہے اور ضروریات کے سامان ہوتے ہیں۔ اکثر ہوتا ہے کہ موافق طبع دوست صبح ملاقات کو آیا، ظہر کی نماز پڑھ کر رخصت ہوا یارات کو رہا صبح ناشتہ کر کے رخصت ہوا۔[۶]

محمد حسین آزاد نے اپنے روز نامچے میں ایران کے سماجی نظام اور وہاں کے لوگوں کی مہمان نوازی کی بڑی تعریف کی ہے۔ اس کے علاوہ آزاد نے جابجا ایران اوراس کے مختلف شہروں کے سماجی، تہذیبی، جغرافیائی، تعلیمی اور تاریخی حالات کی عکاسی کی ہے۔

سر سید نے بھی اپنے سفر نامے میں لندن اور دیگر مقامات کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ جس وقت سر سید مصر پہنچے اور انہوں نے وہاں کے حالات پر نظر کی تو اس کو بہت سی چیزوں سے افسوس ہوا خاص طور سے مسلمانوں کی نااہلی اور ان کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں کے باوجود دوسرے ملکوں اور قوموں کے محتاج ہونے سے وہ کافی ناخوش نظر آئے:

> تمام کارخانہ بہ نسبت انگریزی کارخانے کے نہایت میلا کچیلا تھا۔ ریل کی سڑک اور اسٹیشنوں میں مطلق صفائی نہ تھی لالٹین ایسی میلی تھی کہ شاید مہینوں میں صفائی ہوتی ہو گی۔ انجن میں پانی دینے کے آہنی ستون میں نہایت عمدہ اور خوبصورت بیل بوٹے مرغولہ دار بنے ہوئے تھے مگر ان پر انگل انگل بھر موٹی کائی اور خاک مٹی جمی ہوئی تھی۔ نہروں کا جو میں نے بیان لکھا ان کا

---

[۵] مولانا شبلی نعمانی، سفر نامہ روم و مصر و شام، احسن التجارت، دہلی، ۱۳۳۵ھ، ص ۴۷۔

[۶] سیر ایران، محمد حسین آزاد، کریمی پریس لاہور، ۱۸۸۶ء۔

بھی یہی حال تھا۔ کسی جگہ میں نے پٹری بنی ہوئی نہیں دیکھی، نہر کھودتے وقت جو کنارے مٹی ڈالی تھی اسی طرح پڑی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔[۷]

سرسید کے بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصر میں صفائی کا خیال نہیں رکھا جاتا اور جو گندگی جہاں پڑی ہوتی ہے وہ وہیں رہے گی اس کا صاف کرنے والا کوئی نظر نہیں آتا۔ یہی سبب ہے کہ سرسید نے اپنے سفر نامے میں مسلمانوں کی نااہلی پر جگہ جگہ افسوس ظاہر کیا ہے۔ اس کے برعکس وہ یوروپ کے ممالک میں صفائی اور خوش وضعی کو دیکھ کر بہت خوش ہوتے ہیں۔ پیرس کے سماجی اور معاشرتی حالات کو پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں:

پیرس کے بازار نہایت چوڑے اور دل افزا ہیں۔ دلی میں جو چاندنی چوک کا بازار ہے جس کے بیچ میں شہر ہے اور ایک سڑک نہر کے ایک طرف ہے اور ایک سڑک نہر کے دوسری طرف ہے۔ ان دونوں سڑکوں کو مع نہر کے ملالو تو اس قدر چوڑے بازار تو اکثر بلکہ عموماً ہیں جو ہم نے دیکھے اور بعض اس سے بھی زیادہ چوڑے اور ان کی خوبصورتی تو بیان سے باہر ہے۔[۸]

سرسید کے علاوہ منشی امین چند نے بھی اپنے سفر نامے میں تاریخی، تہذیبی اور سماجی حالات کی عکاسی کی ہے۔ انہوں نے ہندوستان کے مختلف صوبوں کا سفر کیا اور اپنے سفر نامے میں ان صوبوں کی تہذیب و ثقافت اور تاریخی واقعات کو بڑے عمدہ انداز میں پیش کیا ہے۔ انہوں نے کشمیر، امرتسر، جگن ناتھ، کلکتہ، دہلی اور لکھنؤ وغیرہ کے احوال لکھے ہیں۔ تاریخی شواہد و حقائق کو بھی جابجا پیش کیا ہے۔ دہلی شہر کے بارے میں تاریخی شواہد پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

یہ شہر بہت قدیمی ہے۔ اول نام اس کا اندر پرست تھا چنانچہ جس وقت کوروؤں اور پانڈوؤں میں مہابھارت ہو کر دو حصے ملک کے ہوئے تو یہ حصہ پانڈوں کے تعلق ہوا اور تیسناپور کا حصہ کوروؤں کے قبضے میں رہا لیکن بعد ازاں کوروؤں کی نزاع سے یہ شہر ویران ہو گیا۔ اس کے بعد راجہ دہلو نی متصل اس شہر کے اور شہر آباد کر اس کا نام دہلی رکھا۔ غالباً یہ راجہ بکرماجیت سے تین سو برس پہلے تھا۔ ازاں بعد شہر دہلی اجاڑ ہو گیا۔ اب کوسوں تک پرانی عمارات بطور کھنڈر کے پڑی ہوئی ہیں اور جس جگہ یہ شہر آباد ہے اس کو شاہجہاں نے آباد کیا۔ اس باعث اس کو شاہ جہاں آباد بھی کہتے ہیں۔"[۹]

---

[۷] مسافران لندن، سرسید احمد خاں، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۱، ص ۱۱۱۔

[۸] ماخذ سابق

[۹] ماخذ سابق، ص ۵۲۔

اردو ادب میں جب ہم سفر نامے کی روایت پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں دو صورتیں واضح طور پر نظر آتی ہیں۔ پہلی صورت، جس سے اردو سفر نامے کی روایت کا آغاز ہوتا ہے، وہ مغرب کے سفر نامے ہیں۔ عام طور پر جب کسی صنف ادب کی روایت کا باقاعدہ کسی زبان میں آغاز ہوتا ہے تو پہلے شاہکار کی اہمیت صرف تاریخی ہو کر رہ جاتی ہے لیکن اردو ادب کا پہلا سفر نامہ ''عجائبات فرنگ'' تاریخی اعتبار سے جتنی اہمیت کا حامل ہے اس سے کہیں زیادہ وہ اپنے اسلوب بیان اور منظر نگاری کی وجہ سے بھی ادبی اہمیت رکھتا ہے۔

دوسری قسم مذہبی سفر ناموں کی ہے جن میں زیارت حج بیت اللہ کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ایسا سفر نامہ نگار فریضۂ حج ادا کرنے کے بعد دینی جذبے سے سرشار ہو کر واپس آنے کے بعد وہاں ہونے والے تمام مشاہدات و تجربات کو لفظوں میں ڈھال کر بیان کرتے ہیں۔ مذہبی سفر ناموں کی اہمیت اس وجہ سے بھی ہے کہ ان میں ماضی میں اسلام کا مرکز رہے ممالک جو آج پوری طرح خستہ حال ہیں، کے احوال پر بحث کی جاتی ہے۔

کسی بھی ادب کو ارتقائی مدارج طے کر ایک مستقل شکل اختیار کرنا ایک طویل عمل ہے اور کبھی کبھی اس عمل کے مکمل ہونے میں صدیاں گذر جاتی ہیں۔ یوں تو دنیا کی ہر زبان میں سفر نامے ملتے ہیں۔ ان کا معیار چاہے کچھ بھی رہا ہو۔ اردو ادب بھی اس صنف سے خالی نہیں۔ اردو میں ہر طرح کے سفر نامے لکھے گئے ہیں۔ آزادی کے بعد اس میں بہت تیزی آئی۔ ہندوستان اور پاکستان کے ادیبوں نے اس صنف کی طرف بطور خاص توجہ کی اور سفر نامے کو ادب کی ایک اہم صنف بنادیا۔

۱۸۵۷ء کی ناکام انقلابی کوشش کے بعد اردو سفر ناموں کا جو دور ہمارے سامنے نظر آتا ہے اس کی نمائندگی سر سید احمد خاں کرتے ہیں۔ سر سید کے ساتھ شبلی نعمانی، محمد حسین آزاد وغیرہ بھی اردو سفر نامے کو بلندیوں پر پہنچاتے ہیں۔ اس عہد میں ان کے علاوہ ڈپٹی نذیر احمد، محسن الملک وغیرہ بھی سر سید کے ساتھ ادب کی خدمت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ سر سید کے سفر ناموں میں سادگی، بے تکلفی، دلکشی، طرز ادا میں روانی اور منظر کشی واضح طور پر نظر آتی ہے۔ اس دور میں مولانا محمد حسین آزاد کا اپنا ایک الگ انداز ہے۔ ان کے سفر نامہ ''سیر ایران'' اور دوسری تصانیف آب حیات، نیرنگ خیال، سخندان فارس کے مطالعے سے ان کے اسلوب کا پتہ چلتا ہے۔

مولانا شبلی نعمانی بھی اس دور کے صاحب طرز نثر نگار اور سفر نامہ نگار ہیں۔ سر سید، حالی،

محسن الملک، محمد حسین آزاد وغیرہ کے دور میں مولانا شبلی نے اپنی ایک خاص پہچان بنائی۔ انہوں نے سفر نامہ روم و مصر و شام لکھ کر اردو ادب کو گراں قدر سرمایہ عطا کیا۔ مولانا نے ہر موضوع پر قلم اٹھایا اور اپنے پیرایۂ بیان سے اسے زندۂ جاوید بنا دیا۔ ''المامون'' کے دیباچے میں سر سید لکھتے ہیں: ''یہ کتاب اردو زبان میں لکھی گئی ہے اور ایسی صاف وشستہ اور برجستہ عبارت ہے کہ دلی والوں کو بھی اس پر رشک آتا ہوگا۔''

انیسویں صدی میں سر سید، مولانا آزاد، شبلی نعمانی اور بعض دیگر ادیبوں نے کسی نہ کسی مقصد کے تحت یورپ کے ملکوں کی سیاحت کی لیکن ان کے سفر ناموں کے مطالعے سے یہ احساس ہوتا ہے کہ ان کے ذہن میں پہلے سے ہی یہ بات تھی کہ وہ اپنے سفر اور مشاہدات کی تفصیلات سفر نامے کی شکل میں پیش کریں گے۔

انیسویں صدی میں سفر ناموں کی زبان عام طور پر دوسرے موضوعات کے مقابلے میں سادہ اور سلیس ہے لیکن ابتدائی سفر ناموں کی زبان مقفع اور مسجع ہے۔ الفاظ مشکل اور عربی فارسی کے لفظوں کا استعمال اچھا خاصا ہے۔

فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد اردو میں آسان نثر لکھی جانے لگی لیکن اسے مقبول ہونے میں بہت سال لگے۔ شرفایوں تو فارسی کے استعمال کو پسند کرتے یا فارسی سے متأثر نثر لکھتے تھے۔ اس وقت کے سفر ناموں پر یہ اثر صاف طور پر نظر آتا ہے۔

اس طرح انیسویں صدی کے سفر ناموں کے مطالعے کی روشنی میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اردو کی عام نثر کے مقابلے میں سفر ناموں کی نثر زیادہ سلیس، آسان اور بول چال سے قریب ہے۔ سفر ناموں میں جہاں ایک طرف انگریزی اور دوسری طرف دوسری زبانوں کے الفاظ بے تکلفی سے استعمال کئے گئے ہیں وہیں بول چال کے وہ الفاظ جنہیں عام نثر نگاروں نے متروک قرار دے دیا تھا، مثلاً کبھی، کسو، تہیں وغیرہ، بے تکلفی سے استعمال ہوتے ہیں۔

ان سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ابتدائی دور کے سفر نامے کسی مقصد کے تحت لکھے گئے۔ یہ سفر نامے ایک طرف جہاں نئی ایجادات سے لوگوں کو حیران کرتے ہیں تو وہیں دوسری طرف قوموں کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کی بھی پوری کوشش کرتے ہیں۔ ان سفر ناموں کے مطالعے سے یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ سیاحوں نے اپنے سفر کے دوران دوسرے ملکوں اور لوگوں

تک اپنا پیغام پہنچانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ اس دور کے سفر ناموں پر تبصرہ کرتے ہوئے انور سدید لکھتے ہیں:

عہد سرسید میں تین اسالیب بیان نمایاں نظر آتے ہیں۔ اول "قدیم اسلوب" جس میں زبان غرابت کا شکار ہے اور مصنف پورا مفہوم ادا کرنے سے قاصر ہے۔ دوم "حقیقت کا سائنسی انداز میں پیش کرنے کا اسلوب" جسے سرسید نے پروان چڑھایا اور حقیقت کو سادگی سے قاری تک پہنچانے کی کوشش کی۔ سوم "سادگی کو تخلیقی پرکاروں سے مؤثر بنانے کا اسلوب ہے" شبلی نے کسی حد تک اور محمد حسین آزاد نے زیادہ استعمال کرنے کی کوشش کی اور سفر نامے کو جذباتی جدت سے آشنا کر دیا۔[۱۰]

سفر نامے کے دوسرے دور میں ہم دیکھتے ہیں کہ اس میں سفر نامے کے فن میں بہت تبدیلیاں ہو جاتی ہیں۔ ۱۹۰۱ء سے لے آزادی تک جو سفر نامے لکھے گئے ان میں ملک کے سیاسی بحران، بدنظمی، افراتفری، ظلم وزبردستی کے عالم کا ذکر نمایاں طور پر ملتا ہے۔ ہندوستان پر انگریزوں کی حکومت جم چکی تھی اور حکومت کے خلاف بہت سی سیاسی تحریکیں اپنا کام کر رہی تھیں۔ غلامی کے احساس سے عوام میں بے چینی بڑھ رہی تھی۔ ملک میں علم کا فقدان تھا۔ علم کے سلسلے میں غیر ممالک کے سفر ایک خصوصی اہمیت رکھتے تھے تاکہ مغربی علوم سے اس کمی کو دور کیا جائے۔ محمد حسین آزاد کی نثر نے اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا تھا۔ انہوں نے ہندوستان کی پسماندگی کو علم کی روشنی سے دور کرنے کی کوشش کی۔ رسالہ "مخزن" اور اخبار "پیسہ" نے اس سلسلے میں بیش قیمتی ادبی خدمات انجام دیں۔ سرسید بھی اپنا مقصد قوم پر واضح کر چکے تھے۔ اس دور کے سفر نامہ نگاروں میں قاضی عبد الغفار، سرکشن پرشاد، شیخ عبد القادر، قاضی ولی محمد، مولانا راشد الخیری، سید عبد الحی، خواجہ حسن نظامی، سید سلیمان ندوی، خواجہ غلام الثقلین، وغیرہ کو امتیازی اہمیت حاصل ہے۔

بیسویں صدی کے ابتدائی دور کے سفر ناموں سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ ہندوستان میں آزادی کی جدوجہد شروع ہو چکی تھی۔ انگریزی حکومت کے خلاف آزادی کے متوالے اپنی حکمت عملی تیار کرنے میں مشغول ہو گئے تھے۔ لوگ مغربی تہذیب کو نفرت کی

---

(۱۰) سخن دان فارس، محمد حسین آزاد، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۲۰۰۵، ص ۱۱۴۔

نگاہوں سے دیکھتے تھے اور مغربی علوم سے دور بھاگتے تھے۔ لیکن آہستہ آہستہ انگریزی ادب نے ہندوستان میں اپنی راہ ہموار کرنا شروع کر دی۔ سیاسی رہنماؤں، ادیبوں اور شعرا وغیرہ کو اس بات کا احساس ہو گیا کہ ہندوستان کی آزادی کا مسئلہ صرف نفرت سے حل نہیں ہو سکتا اس لئے اس دور کے سفر ناموں میں سیاسی، تعلیمی اور انقلابی فضا قائم کرنے کی کوشش ملتی ہے جس سے لوگوں میں علم و عمل سے محبت، تہذیب و تمدن کی بڑائی اور افلاس و غربت سے نفرت پیدا ہونے لگی۔ اس دور میں سفر ناموں میں نکھار پیدا ہوا اور بہت زیادہ سفر نامے لکھے گئے لیکن ان سفر ناموں میں سے بہت سے اپنی جگہ نہیں بنا سکے۔

آزادی کے بعد ہندوستان میں سیر و سیاحت میں تیزی آگئی اور سیاحوں میں خود اعتمادی بڑھ گئی۔ اس لئے اس دور کے سفر نامہ نگاروں نے دنیا کا ہر زاویے سے مشاہدہ کیا۔ آزادی کے بعد ابتدائی دور کے سفر ناموں میں مشرقی سیاحت حاوی رہی مگر جلد ہی ان کا رخ مغرب کی طرف ہو گیا۔ اس نئے دور میں سفر ناموں کی کئی صورتیں نظر آتی ہیں: کہیں وہ روزنامچے کی شکل میں ہیں تو کہیں ڈائری کی شکل میں نظر آتے ہیں، کہیں وہ رپورتاژ ہیں تو کہیں وہ خطوط کی شکل میں ہیں اور کہیں مزاحیہ۔

دور جدید میں بہت سے سیاحوں اور ادیبوں نے سفری ادب کو ایک نیا رنگ و آہنگ دیا اور سفر نامے کے بیان کو تخلیقی اسلوب میں پیش کیا اور سفر نامے کی زبان کو ادب کی زبان بنایا۔ اس دور کے سفر نامہ نگاروں میں سلامت اللہ۔ سید احتشام حسین، حکیم محمد سعید، اندرجیت سنگھ تکلسی، خواجہ حسن نظامی، رام لعل، جگن ناتھ آزاد، سید عابد حسین، مستنصر تارڈ، مجتبیٰ حسین، بریگیڈیر گلزار حسین، ثریا خورشید، رفعت سروش، ہرچرن چاولہ، مظفر حنفی، جمشید مرزا، مسعود حسن رضوی، انتظار حسین، ممتاز مفتی، بلراج کومل، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، صالحہ عابد حسین، سید ابوالحسن علی ندوی، کمار پاشی، ابن انشا وغیرہ کے سفر نامے اہمیت کے حامل ہیں۔

غرض یہ کہ سفر ناموں کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اردو ادب کی اصناف میں سفر نامہ ایک اہم مقام حاصل کر چکا ہے۔ اردو نثر کو عام فہم اور آسان بنانے میں انہوں نے بہت بڑا رول ادا کیا ہے۔ مختصراً ہم کہہ سکتے ہیں کہ اردو میں سفر نامہ نگاری کی جو روایت اٹھارہویں صدی کے نصف میں شروع ہوئی تھی آج اس نے ایک طویل سفر طے کر لیا ہے اور اب اس میں وہ تمام فنی خصوصیات موجود ہیں جو دوسری زبانوں کے سفر ناموں میں پائی جاتی ہیں۔

مابعد جدیدیت اور اُردو ادب کا جدلیاتی رویّہ

ڈاکٹر الطاف انجم
مرکز برائے فاصلاتی و آن لائن تعلیم، کشمیر یونیورسٹی، حضرت بل، سری نگر ۱۹۰۰۰۶
altafurdu@gmail.com

موجودہ زمانے میں غور و فکر کے زاویے بدل گئے ہیں اور اشیاء و مظاہر کو دیکھنے اور پرکھنے کے طریقوں میں خاطر خواہ تبدیلی در آئی ہے۔اس تناظر میں ادب کی تخلیق اور اس کی تحسین کے طریقہ ہائے کار بھی تغیر و تبدل سے آشنا ہوئے۔ ہم اس مقالے میں 'مابعد جدیدیت اور اُردو ادب کا جدلیاتی رویّہ' کے حوالے سے اُردو کے تناظر میں درج ذیل سوالات پر غور کریں گے:

۱۔ اُردو ادب کی شعریات میں حالیہ برسوں کی سماجی و سائنسی تبدیلی کی بدولت کس طرح کی تبدیلی محسوس کی جارہی ہے ؟

۲۔ مغرب میں جس مابعد جدیدیت کی شروعات دوسری عالمگیر جنگ کے بعد ہوئی کیا وہ اُردو میں مِن و عن پروان چڑھی ؟

۳۔ اُردو میں ۱۹۶۰ء کی دہائی میں جس جدیدیت کا آغاز ہوا وہ کن معنوں میں ''جدید'' تھی اور اُس سے کس طرح کے مغالطے نے جنم لیا؟

۴۔ اُردو میں جس مابعد جدیدیت کا تذکرہ ہوتا ہے کیا وہ اُردو معاشرے کے تہذیبی اور ثقافتی پس منظر سے ہم آہنگ ہے ؟

۵۔ اُردو ادب نے اکیسویں صدی کے تغیر پذیر دور میں کس طرح کے جدلیاتی رویّہ کو اختیار کیا؟

۶۔ اُردو کے عام ادیبوں اور دانشوروں نے کس طرح مابعد جدیدیت سے معاملہ کیا؟

۷۔ کیا موجودہ عہد کو مابعد جدیدیت کے برعکس کوئی اور نام دیا جاسکتا ہے ؟

اکیسویں صدی کی اِن دو دہائیوں میں سائنسی، سیاسی، لسانی، تہذیبی، ثقافتی اور جمالیاتی اعتبار سے اتنی اور ایسی تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں جن کا مشاہدہ اِس سے پہلے چشمِ فلک نے شاذ ہی کیا ہو گا۔ ہم یہ بات بخوبی محسوس کرتے ہیں کہ اطلاعاتی تکنالوجی نے گزشتہ برسوں میں جو محیرّ العقول ترقی

کے زینے طے کیے ہیں وہ طلسم نہ سہی لیکن ہوش رُبا ضرور ہے۔ اس دوران یہ دعویٰ ایک بار پھر مسترد ہوا کہ سائنسی و علمی ترقی انسان کی صلاح و فلاح کی ضامن ہے بلکہ سائنسی انکشافات اور ایجادات نے جنگی ساز و سامان اور دوسرے آلاتِ حرب و ضرب کو اس انداز سے وضع کرنے کی طرح ڈالی کہ خود ایک سائنسداں تعمیر کے بجائے تخریب کو ہی حاصلِ کائنات سمجھتا ہے۔

اس سائنسی ترقی کا ایک دوسرا رُخ قدرے روشن ہے جس نے انسانی زندگی کی کلفتوں کو کم کرنے کی سعی کی ہے۔ اس دوران اطلاعاتی تکنالوجی نے ترسیل و ابلاغ کے اتنے اور ایسے وسائل پیدا کیے ہیں کہ اب اُن کا شمار بھی مشکل معلوم ہوتا ہے۔ یہ وسائل جہاں ایک طرف مثبت طرزِ زندگی گزارنے میں کلیدی کردار ادا کرتے ہیں وہیں اِن سے یہ التباس بھی پیدا ہو رہا ہے کہ ایک انسان ہزاروں لاکھوں افراد کی دوستی کا شرف حاصل کر رہا ہے اور اتنی ہی تعداد میں دوست اس کے غمخوار ہیں جب کہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ واضح رہے کہ حقیقت یہ ہے کہ یہ برادریاں، یہ لمبی چوڑی دوستیاں، یہ غم گساریاں اُس وقت تک ہی ہیں جب تک آپ کا ڈیجیٹل ڈوائس فعّال ہے۔ ایک بار وہ بند ہو جانے پر استعمال کنندہ اِن تمام ہزاروں لاکھوں افراد کی دوستوں سے محروم ہو جاتا ہے۔

بعض طالع آزما لوگ، جن کے سر میں ادیب بننے کا سودا سمایا ہوا ہے، اِن دنوں ادب پاروں کی تخلیق اور اُن کے تجزیے کے لیے مصنوعی ذہانت کے مختلف ذرائع سے استفادہ کر رہے ہیں۔ اس تمہید کا مقصد یہ ہے کہ اکیسویں صدی میں سائنسی، معاشرتی اور سیاسی میدانوں میں واقع تبدیلیوں نے بنی نوع انسان کی طرزِ زندگی، رہن سہن، آدابِ خورد و نوش، معاشی ڈھانچہ، سماجی مرتبہ، فکر و نظر کے زاویے، مجلس سازی کے طریقے وغیرہ متزلزل کر دیے ہیں۔ اس تناظر میں ادب کا نئے حالات و واقعات سے متعارف ہونا، بلکہ اُن کو موضوع بنا کر پیش کرنا ایک اہم ادبی ذمہ داری ہے۔

اس سیاق میں اُردو کا ادبی منظر نامہ مناسب حد تک قابلِ قدر ہے۔ فکشن کی سطح پر سیکڑوں فن پارے ناولوں اور افسانوں کی صورت میں منصۂ شہود پر آئے جو بدلتی سماجی، سیاسی، سائنسی، معاشرتی، لسانی و ثقافتی تبدیلیوں سے نہ صرف ہم آہنگ ہیں بلکہ انسانی زندگی کے قوسِ قزح کے مختلف رنگوں سے مزیّن بھی ہیں۔

مغرب میں مابعد جدیدیت دوسری عالمگیر جنگ کے خاتمے کے بعد وجود میں آئی جب کہ اُردو

میں مابعد جدیدیت کے مباحث ۱۹۸۰ء کی دہائی میں شروع ہوئے۔ اب جب کہ اُردو کی کچھ تحریکات ورجحانات مغربی اثرات کے تحت نمو پذیر ہوئی ہیں جنہیں، بقولِ وہاب اشرفی، کم و بیش چالیس سال کا وقفہ اُردو میں پیر جمانے میں لگ جاتا ہے لیکن اطلاعاتی تکنالوجی کی غیر معمولی ترقی نے مابعد جدیدیت کے ضمن میں اس عرصے کو کم کر دیا ہے۔ مغرب میں مابعد جدیدیت کی اصطلاح کو جان واٹکنس چاپمین نے ۱۸۳۰ء میں مصوری کے ضمن میں استعمال کیا تھا۔ اس کے بعد جے-ایم-تھامپسن نے ۱۹۱۴ء میں مذہبی عقائد کی تنقید اور انسانی رویّوں میں تبدیلی کے تناظر میں یہ اصطلاح استعمال کی۔ لیکن باضابطہ طور پر آرنلڈ ٹائن بی نے اپنی کتاب A Study of History میں اس اصطلاح کو فروغ دیا۔ اس کے بعد دنیا کی مختلف زبانوں کے تنقیدی ادب میں یہ اصطلاح متواتر استعمال ہونے لگی۔ علاوہ ازیں تہذیب و ثقافت، فنونِ لطیفہ اور معاشرتی علوم کے میدانوں میں بھی یہ اصطلاح اپنی جگہ بنانے لگی۔ تاہم اُردو میں جس ''مابعد جدیدیت'' کو رواج دیا گیا وہ مغرب کی ''مابعد جدیدیت'' سے قدرے مختلف ہے۔ دریدا، میشل فوکو، لیوٹارڈ، جان بادریلارد، فریڈرک جیمسن جیسے مفکرین نے مہابیانیہ، طاقت، حقیقت اور علم کے روایتی تصور کو مسترد کر کے انہیں تغیر پذیر مغربی معاشرے کے تقاضوں کے مطابق تشکیل دینے کی کوشش کی۔ اُردو میں مابعد جدیدیت کے بنیادی مباحث کی شروعات انہی مغربی مفکرین کے حوالوں سے ہوئی، جس میں گوپی چند نارنگ، وزیر آغا، قمر جمیل، فہیم اعظمی، وہاب اشرفی اور حامدی کاشمیری جیسے اساتذہ کی خدمات قابلِ قدر ہیں لیکن کچھ عرصے کے بعد ہی اُردو کے تہذیبی اور معاشرتی پس منظر میں ''مابعد جدیدیت'' کے مباحث قائم کیے جانے پر اصرار کیا جانے لگا جس کے بعد مذکورہ بالا اساتذہ کے علاوہ مزید صاحبِ بصیرت اساتذہ نے مابعد جدیدیت کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا۔ اس قبیل میں قاضی افضال حسین، عتیق اللہ، ضمیر علی بدایونی، ناصر عباس نیّر، ابوالکلام قاسمی، شافع قدوائی، قدوس جاوید، مولا بخش وغیرہ نے نہ صرف یہ کہ مابعد جدیدیت کو اُردو کے معاشرتی اور تہذیبی پس منظر میں سمجھنے کی کوششیں کیں بلکہ مابعد جدید تھیوری کے نظریات[1] کے تحت اُردو کے ادب پاروں کو جانچنے اور پرکھنے کا آغاز بھی کیا۔ یہاں پر ایک مغالطے کو دور کرنا ناگزیر ہے

---

[1] مابعد جدید تھیوری کے تحت جن تنقیدی نظریات کا تعارف کیا جاتا ہے اُن میں ساختیاتی تنقید، پس ساختیاتی تنقید، نومارکسی تنقید، بین المتونی تنقید، تانیثی تنقید، قاری اساس تنقید، مابعد نو آبادیاتی تنقید، نو تاریخی تنقید، اکتشافی تنقید اور امتزاجی تنقید خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

کہ اُردو کی مابعد جدیدیت مغربی مابعد جدیدیت سے ایک فاصلے پر قائم ہے کیوں کہ یہ ۱۹۶۰ء کے آس پاس شروع ہوئی جدیدیت کے ردِ عمل کا ایک اعلامیہ ہے۔یوں اس میں مغربی مابعد جدید مفکرین کے فکر و فلسفے سے زیادہ جدیدیت کے دور کے ادب کی موضوعاتی اور اسلوبیاتی پیچیدگیوں کو دور کرنے اور تخلیقات کو عصری تقاضوں کے تحت جانچنے کے پیمانے وضع ہوئے ہیں جو تھیوری کے تحت ادبی سطح پر عام ہوئے۔

مذکورہ بالا نکات کی روشنی میں اُردو ادب کا گزشتہ تیس سال کا سرمایہ اپنے گرد و پیش کے خوب و زشت کی عمدہ ترجمانی سے عبارت ہے جسے ہم معاشرتی جدلیت سے تعبیر کرسکتے ہیں۔ ہمارے قلم کار حضرات بابری مسجد کے انہدام سے لے کر کووڈ-۱۹ وبائی بیماری کی ہولناکیوں تک اور صارفینی نظام کی نِت نئی کارستانیوں سے لے کر حالیہ برسوں کی مذہبی شدت پسندی تک انسانی زندگی کے ہر پہلو کو نہایت فنی ہنر مندی، جمالیاتی پختگی اور لسانی دروبست کے ساتھ اپنی تخلیقات میں پیش کرتے رہے ہیں۔ مجموعی طور پر اگر دیکھا جائے تو ناولوں میں ’’پوکے مان کی دنیا‘‘ (مشرف عالم ذوقی)، ’’مکان‘‘(پیغام آفاقی)، ’’صفر سے ایک تک‘‘(مرزا اطہر بیگ) وغیرہ نے تغیر پذیر انسانی زندگی کو اپنا موضوع بنایا۔ اسی طرح ہمارے افسانہ نگاروں نے زندگی کی تلخ و تُرش حقیقتوں کو اپنے افسانوں میں کمالِ مہارت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ پیغام آفاقی، سلام بن رزاق، مشرف عالم ذوقی، بیگ احساس، حسین الحق، ذکیہ مشہدی، اسلم جمشید پوری، بشیر مالیر کوٹلوی، ناصر عباس نیّر، ریاض توحیدی، علی اکبر ناطق، احمد صغیر جیسے تخلیق کار اُردو افسانے میں روحِ عصر کی عمدہ انداز میں ترجمانی کر رہے ہیں۔ یہاں وقت کی تنگ دامانی کے احساس سے تخلیقی متون کے اقتباسات پیش کرنے احتراز برتا جارہا ہے۔ افسانوی متن کے اقتباسات کو کسی دوسرے موقع پر پیش کرتا ہوں تاکہ قارئین کے سامنے دلائل کے ساتھ اپنے مفروضات رکھے جاسکیں۔

فکشن کے ساتھ ساتھ شاعری میں نئی آوازیں ابھریں جنھوں نے بلیغ انداز میں جہاں خارجی زندگی کے گرد و پیش کو فکری گہرائی اور جمالیاتی خوبیوں کے ساتھ اُجاگر کیا وہیں انسان کی داخلی کائنات کے طور وارض کو اپنے کلام میں منقّش کیا۔ کچھ اشعار بطورِ مثال پیش کیے جارہے ہیں:

مرا تو اِس محبت سے بھروسہ اٹھنے والا ہے
اُسے بھی اپنے وعدے سے مکر جانے کی جلدی ہے جعفر تابش

بھلا آخر میں گاؤں کب لوٹوں گا اے تابش
مرے گاؤں کے لوگوں کو شہر جانے کی جلدی ہے — جعفر تابش

وہ گاؤں کا ایک ضعیف دہقاں، سڑک کے بننے پر کیوں خفا تھا
جب اُس کے بچے، جو شہر جاکر کبھی نہ لوٹے، تو لوگ سمجھے — عرفان ستار

ازل سے ہی یہی دستور دنیا کا رہا ہے
جسے جینا ہے، اُسے مرنے پر اُکسایا گیا ہے — مہتاب حیدر نقوی

ایک میں ہوں اور دستک کتنے دروازوں پہ دوں
کتنی دہلیزوں پہ سجدہ ایک پیشانی کرے — مہتاب حیدر نقوی

اب کوئی قصہ نہ چھیڑو، پھر کبھی کرنا حساب
زندگی نے ہم سے کیا چھینا ہے کیا رہنے دیا — عالم خورشید

گوشہ نشیں ہیں، انجمن آرا نہیں ہیں ہم
لیکن یہ معجزہ ہے کہ تنہا نہیں ہیں ہم — طارق متین

یہ دل کسی کو کیوں مگر تلاش کرتا ہے
سفر کے دشت میں گھر کیوں تلاش کرتا ہے — عبدالاحد ساز

انسانیت کو خیر نہیں شر بھی چاہیے
نیزے کی پرورش کے لیے سر بھی چاہیے — شکیل اعظمی

اب سوال یہ ہے کہ موجودہ دور کے تخلیقی ادب[۲] کو ہم بعد جدید ادب قرار دیں یا اِسے کسی اور حاوی رجحان کے تحت سمجھنے کی کوشش کریں یا اِسے کوئی نام دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے؟ اس ضمن میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اُردو ادب کے ابتدائی دنوں سے لے کر بیسویں صدی کے آخر تک ہر دور کسی نہ کسی غالب رجحان، رویّہ یا تحریک کے نام سے موسوم رہا ہے۔ اس اعتبار سے موجودہ دور کے ادب کو مابعد جدید ادب کے نام سے موسوم کرنے میں کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے، اگرچہ مغرب میں اور اُردو میں بھی کچھ ناقدین نے مابعد جدیدیت کی موت کا باضابطہ اعلان بھی کر دیا ہے۔ یونیورسٹی آف ایگزیٹر سے وابستہ ایلن کِربے نے یہ کہہ کر مابعد جدیدیت کی

[۲] یہاں تنقیدی ادب کی بحث نہیں اٹھائی گئی ہے کیونکہ اس مقالے میں صرف مابعد جدید ادب کی صورتِ حال تک گفتگو محدود رکھی گئی ہے۔

موت اور اِسے دفنانے کا اعلان کر دیا ہے کہ نئی تکنالوجی اور معاصر سماجی قوتوں کے دباؤ کے تحت علم اور طاقت کی نئی ساخت (پیراڈئم) نے مابعد جدیدیت کی جگہ لی ہے[۳]۔ اسی طرح فرانس کے نکولس بوریو نے ۲۰۰۹ء میں سماجی اور ثقافتی اقدار پر صارف ماحول کے غلبے کو شدت سے محسوس کرتے ہوئے مابعد جدیدیت کی موت کا اعلان کر کے "متبادل جدیدیت (Alternate Modernism)" کا تصور پیش کیا۔ اُردو میں پروفیسر قدوس جاوید نے نکولس بوریو کے "مابعد جدیدیت کی موت" کے تصور کے حوالے سے "مابعد جدیدیت کی موت" کے نام سے مقالہ لکھ کر ایک نئے مباحثہ کو جنم دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ترقی پسندی اور جدیدیت کے بعد مابعد جدیدیت ایک سماجی، ثقافتی اور ادبی سچائی کے طور پر نئی صدی کے آغاز سے پہلے ہی اپنی اہمیت منوا چکی تھی لیکن اب اس صدی کی تیسری دہائی تک آتے آتے عالمی پیمانے پر اور اردو دنیا میں بھی بعض حلقوں کی جانب سے "مابعد جدیدیت کی موت" (Death of Postmodernism) کی باتیں بھی کی جانے لگی ہیں۔ اور ایک طبقہ یہ سوال بھی کرتا ہے کہ مابعد جدیدیت کے بعد کیا؟ اس طرح کے کسی بھی سوال کو ہلکے میں نہیں لینا چاہیے اور اس پر غور کیا جانا چاہیے کہ کیا واقعی مابعد جدیدیت کی موت ہو چکی ہے؟ اگر یہ سوچ درست ہے تو پھر اس پر بھی غور کیا جانا چاہیے کہ ترقی پسندی کو جدیدیت نے معزول کیا تھا اور جدیدیت کی جگہ مابعد جدیدیت نے لی تھی لیکن اب مابعد جدیدیت کا متبادل (Alternate) کیا ہے؟ یا کیا ہو سکتا ہے؟[۴]

مابعد جدیدیت کی تعریف میں ایک لچکدار رویّے کا اظہار ہوتا ہے، اور اس کے اندر کسی بھی نظریہ کی حتمیت کا شائبہ تک نہیں ہے۔ اس لیے موجودہ دور کو ہم مابعد جدید کہہ سکتے ہیں تو اُس سے یہ بھی مراد ہے کہ ہم نے اُس جدیدیت کے سحر سے خود کو آزاد کر لیا ہے جس کی منفرد خصوصیات نے ادب اور قاری کے درمیان ایک ناقابلِ عبور دیوار کھڑی کر لی تھی۔ بہر حال یہ دور وابستگی کا نہیں بلکہ ناوابستگی کا ہے جس میں ہر ایک تخلیق کار کو اپنی اپنی تخلیقی کائنات اپنی صوابدید کے مطابق آراستہ کرنے کی آزادی میسر ہے۔

---

[۳] ایلن کِربے نے اِن خیالات کا اظہار اپنے مقالہ بعنوان "The Death of Postmodernism and Beyond" میں کیا ہے جو دوماہی رسالہ Philosophy Now میں لندن سے ۲۰۰۶ء میں شائع ہوا۔

[۴] قدوس جاوید، "مابعد جدیدیت کی موت یا متبادل جدیدیت"، شش ماہی ادب و ثقافت، اُردو ثقافتی مرکز، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی، حیدرآباد، شمارہ ۱۴، مارچ ۲۰۲۲ء، ص: ۶۷

ملی مسائل

حفظ قرآن کے بارے میں اسرار عالم کے اشکالات

ڈاکٹر ظفر الاسلام خان

ہمارے ایک محترم دوست نے اسرار عالم کی ایک تحریر کے کچھ صفحات کی پی ڈی ایف کاپی میرے تبصرے کے لئے عرصہ قبل ارسال کی تو میں نے اسے نظر انداز کر دیا۔ ان کے یاد دلانے پر میں نے اب وہ تحریر پڑھی اور سر پیٹ لیا۔ یہ تحریر اسرار عالم کی کتاب "امت کا بحران" میں شامل ہے۔ ہر دعوی بغیر کسی حوالے کے کیا گیا ہے۔ پھر اس دعوے کی بنیاد پر بڑے بڑے فیصلے سنا دیے گئے ہیں اور نص قرآنی کو ہی مشکوک قرار دے دیا گیا ہے۔ اتنی جسارت تو مستشرقین نے بھی نہیں کی تھی۔

مستشرقین کو قرآن پاک کے مواد کے بارے میں اشکال ہے جبکہ اسرار عالم کا کہنا ہے کہ آج جو قرآن امت کے ہاتھوں میں ہے وہ، وہ قرآن نہیں ہے جو حضرت محمد ﷺ پر نازل ہوا تھا۔ ان کا اصرار ہے کہ اوائل اسلام میں ایک "سازش" کے ذریعے قرآن پاک کے نسخوں کو بار بار تلف کیا گیا۔ حضرت عثمانؓ کی جاری کردہ ماسٹر کاپی (المصحف الإمام) کے بارے میں ان کو شک ہے ہی۔ ان کے خیال میں یہ "سازش" بالآخر اموی خلیفہ عبد الملک بن مروان کے زمانے میں حجاج بن یوسف کے ہاتھوں پوری طرح کامیاب ہو گئی۔

انھوں نے یہ سراسر غلط دعوی بھی کیا ہے کہ خلیفہ سومؓ کا سرکاری نسخہ "ہر جگہ بھیجا گیا"۔ صحیح یہ ہے کہ اس وقت کے اسلامی صوبوں (امصار) کے صدر مقام کو اس ماسٹر کاپی کا ایک ایک نسخہ بھیجا گیا کہ اب اسی پر اعتماد کیا جائے اور اسی سے حسب ضرورت مزید کاپیاں بنائی جائیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت امصار، جیسے ایران، شام، مصر اور فارس، میں الگ الگ غیر مستند نسخے استعمال ہو رہے تھے جن کی وجہ سے مستقبل میں شدید اختلافات پیدا ہونے کا خطرہ تھا۔ امصار میں استعمال ہونے والے نسخوں کے رسم الخط بھی الگ الگ تھے اور ان میں مختلف عرب لہجات کا استعمال کیا گیا تھا جبکہ قرآن پاک لہجۂ قریش میں نازل ہوا۔

اسرار عالم کا یہ دعوی بھی ہے کہ آج "ساری دنیا میں صحیفۂ عثمان باقی اور دستیاب ہے"۔ ایسا دعوی کسی نے آج تک نہیں کیا۔ آج اصلی مصحف عثمانی یا المصحف الامام (قرآن پاک کی ماسٹر کاپی) کا

صرف ایک نسخہ مستند طور سے دنیا میں موجود ہے، باقی سب نسخے ماسٹر کاپی سے کی گئی کاپیاں ہیں۔

اس تاریخی کام کے لئے حضرت عثمانؓ نے ام المؤمنین حضرت حفصہؓ کے پاس محفوظ قرآن پاک کی کاپی حاصل کی اور حضرت زید بن ثابتؓ کی صدارت میں حفاظ اور کاتبین وحی کی ایک کمیٹی بنادی تاکہ وہ ایک ماسٹر کاپی (المصحف الامام) تیار کرے۔ بہت محنت کے بعد یہ ماسٹر کاپی تیار ہوئی اور اس ماسٹر کاپی کی کاپیاں امصار کے صدور مقام بھیج دی گئیں اور حکم دیا گیا کہ صرف اسی پر اعتماد کیا جائے اور باقی تمام غیر مستند نسخے حاصل کر کے تلف کر دیے جائیں۔

حضرت علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ کے پاس خود اپنی کاپی موجود تھی لیکن انھوں نے بھی حضرت عثمان کی جاری کردہ ماسٹر کاپی کو تسلیم کیا۔ حضرت علیؓ کی کاپی زمانی اعتبار سے ترتیب دی گئی تھی جبکہ حضرت عثمان کی کاپی حضور پاک ﷺ کی نشاندہی کے مطابق ترتیب دی گئی تھی۔ حضرت علیؓ نے ہی اپنے زمانۂ خلافت میں ابوالأسود الدؤلی (م:۶۹ھ) کو حکم دیا کہ عربی نحو اور خط کے قواعد مرتب کریں تاکہ عربی رسم الخط اور بالخصوص نص قرآنی کی لکھاوٹ میں مکمل یکسانیت ہو جائے۔ بعد میں عراق کے اموی گورنر الحجاج (م:۹۵ھ) کے حکم سے خط قرآنی کے املاء اور آیات کے وقف کے نشانات کی تحدید کی گئی جس کی اتباع آج تک تمام قرآنی نسخوں میں کی جاتی ہے۔

آج دنیا بھر میں موجود قرآن پاک کے تمام نسخے حضرت عثمانؓ کے نص کی اتباع کرتے ہیں بلکہ اس کی لکھاوٹ (الرسم العثمانی) کی بھی اتباع کرتے ہیں جو کبھی کبھی آج کے رائج عربی رسم الخط سے مختلف ہوتی ہے۔ حضرت عثمانؓ کے جاری کردہ المصحف الامام کی ایک اصل کاپی آج Russian Academy of Sciences کے انسٹی ٹیوٹ برائے مخطوطات، واقع سان بطرسبرگ، میں محفوظ ہے اور کبھی کبھار خصوصی مسلم قائدین کے دوروں پر روسی حکام ان کو اس نادر مصحف کی کاپی پیش کرتے ہیں۔ اس مصحف کے بعض صفحات پر حضرت عثمانؓ کے مبینہ خون کے نشانات ہیں جن کو سنہ ۶۵۶ء میں باغیوں نے قرآن پاک کی تلاوت کرتے ہوئے شہید کر دیا تھا۔ اس نسخے کی ایک کاپی سونے کے کاغذ پر ۲۰۰۶ میں طبع کی گئی، پھر ایک اور کاپی سنہ ۲۰۱۰ میں چاندی کے کاغذ پر تیار کی گئی۔ ان کو روس بین الاقوامی نمائشوں میں پیش کرتا ہے۔ چاندی کے ورق پر مطبوعہ کاپیوں کو روسی حکام نے بعض عرب اور مسلم عمائدین کو تحفۃً پیش کیا۔ قرآن پاک کے تمام قدیم ترین نسخے بھی اسی المصحف الامام سے کاپی کئے گئے ہیں۔ حضرت عثمانؓ کی ماسٹر کاپی سے نقل کردہ کاپیاں آج ترکی کے توپکاپی میوزیم، مسجد اقصی کے قبۃ الصخرۃ، اور دمشق کی مسجد اموی میں محفوظ ہیں[1]۔

---

[1] دیکھئے: ظفر الاسلام خان [مترجم وشارح] Glorious Quran، تیسرا ایڈیشن، فاروس میڈیا، دہلی، ۲۰۲۵، ص: ۲۵-۲۶۔

اسرار عالم کا دعویٰ ہے کہ "تحقیق" کے دوران ان کو ۲۰ (بیس) "صحائف عثمان" (عثمانؓ کے صحیفوں) کا علم ہوا۔ اول تو "صحائف عثمان" کی اصطلاح ہی من گھڑت ہے۔ اب تک "صحیفۂ عثمان" یا "مصحف عثمان" نامی ایک ماسٹر کاپی کی بات ہوتی تھی۔ حضرت عثمان نے ایک ماسٹر کاپی تیار کرائی تھی جس کو "المصحف الامام" کہا جاتا ہے، پھر اسی ماسٹر کاپی کے متعدد نسخے بنوا کر امصار کے صدور مقام کو بھیج دیے گئے کہ اب صرف اسی پر اعتماد کیا جائے۔ آج اس ماسٹر کاپی کا صرف ایک نسخہ روس میں محفوظ ہے جیسا کہ ابھی ذکر ہو چکا ہے۔

یہاں اسرار عالم "صحائف" کی بات کر رہے ہیں گویا حضرت عثمانؓ نے متعدد الگ الگ نسخے تیار کرائے تھے جو ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ یہ پوری طرح بے سروپا بات ہے۔ اپنی اس نادر تحقیق کا حسب معمول اسرار عالم نے کوئی حوالہ نہیں دیا اور نہ یہ بتایا کہ ان کے اکتشاف کردہ یہ بیس نسخے کہاں کہاں محفوظ ہیں۔ اس بات سے تو کسی کو انکار نہیں کہ حضرت عثمانؓ نے ماسٹر کاپی کی متعدد کاپیاں بنوا کر امصار کے صدور مقام بھیج دی تھیں۔ ایسی کاپیاں اگر ابن بطوطہ اور ابن جبیر وغیرہ نے اپنے اسفار میں دیکھی ہوں تو یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ وہ کوئی دوسرے مختلف نسخے تھے۔

اگر قرآن پاک کے تمام منتشر و نامکمل نسخے حضرت عثمانؓ نے جمع کر کے جلا نہ دیے ہوتے اور ایک باضابطہ کمیٹی کے تیار کردہ مکمل نسخے کو سرکاری منظوری دے کر تمام ممالک اسلامیہ کے صدور مقام نہ بھیجا ہوتا تو امت میں آج تک انتشار باقی رہتا اور سینکڑوں گروہ اپنے اپنے نسخوں کو ہی اصلی اور حتمی کہنے پر اصرار کرتے۔ خلیفۂ ثالث کا یہ اقدام ایک عبقری اور انقلابی عمل تھا جس کی وجہ سے امت مسلمہ امت واحدہ کے طور پر آج تک باقی و قائم ہے۔ اسرار عالم کے دعوے کی مثال ایسی ہی ہے کہ کسی کو ایک مطبوعہ کتاب کے ایک ہی ایڈیشن کے نسخے مختلف لائبریریوں میں ملیں تو وہ دعویٰ کر بیٹھے کہ اسے مذکورہ کتاب کے الگ الگ نسخے مختلف لائبریریوں میں ملے ہیں۔

اگر ہم اسرار عالم کے تھیسس کو تسلیم کر لیں تو، معاذاللہ، اللہ پاک اور قرآن پاک کی تکذیب لازم آتی ہے کیونکہ قرآن پاک میں اللہ پاک نے اعلان کیا ہے کہ انھوں نے ہی قرآن پاک کو نازل کیا ہے اور وہی اس کی حفاظت کریں گے (إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ-الحجر:۹)۔ اسرار عالم کا یہ خود ساختہ نظریہ، خدائی اعلان اور وعدے کی تکذیب کرتا ہے اور صرف یہی بنیاد اسرار عالم کے تھیسس کو رد کرنے کے لیے کافی ہے۔

اسرار عالم کے یہاں بڑا غرور اور غلو ہے۔ حجاج بن یوسف کی نگرانی میں ہونے والے تاریخی کام کو انھوں نے "بدترین اور خبیث ترین تباہی" قرار دیا ہے۔ حجاج بن یوسف کے مظالم کے بارے میں ہمیں اسلامی تاریخ کے اندر مفصل روایات ملتی ہیں لیکن قرآن پاک کی تنقیط، اعراب، وقف کی تحدید اور ضبطِ املاء کے تاریخی عمل کو کبھی کسی نے موردِ الزام نہیں گردانا۔ یہ بھی حضرت عثمانؓ کے عمل کی طرح ایک عبقری اور انقلابی عمل تھا۔ اس وقت بھی بہت سے حفاظ قرآن موجود تھے لیکن اس بات کا خدشہ پوری طرح موجود تھا کہ وقت گزرنے پر مختلف امصار میں قرآنی الفاظ کو غلط طور سے پڑھا جا سکتا ہے جس سے ان کے تلفظ اور معانی میں فرق آسکتا ہے۔ حجاج کے عمل سے نص قرآنی کو صحیح طور سے پڑھنے کا طریقہ قیامت تک کے لیے مقرر ہو گیا۔ اسی کے ساتھ یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ قدیم کتب تفسیر و قراءات میں مختلف قراءات اور اختلاف قراءات کی تفصیلات موجود ہیں لیکن کہیں اتنا اختلاف نہیں ہے کہ معنی بدل جائے۔ حجاج بن یوسف کے ایسے عبقری عمل کے لیے اسرار عالم نے دریدہ دہنی سے تکلیف دہ الفاظ استعمال کیے ہیں۔

بڑے بڑے، بلا دلیل، دعوے کرنے کے بعد اسرار عالم کی تان سورۃ البقرۃ کی پہلی آیت "الم" پر ٹوٹی ہے۔ وہ پوچھتے ہیں کہ "المّ میں تشدید نہ پڑھنے کی کیا دلیل ہے؟" پھر اس بات کو انھوں نے اتنا بڑھایا کہ دعوی کر دیا کہ "کم از کم ایک آیت یا ایک کلمہ یا ایک تشدید کی حد تک اس امت محمدیہ میں قرآن کا تواتر جسمانی، حقیقی اور معنوی طور پر مجروح ہو چکا ہے"۔ دراصل اپنی جہالت کی وجہ سے اسرار عالم نے یہ سارا مقدمہ کھڑا کر دیا ہے اور بڑے بڑے الفاظ و اوصاف استعمال کر کے اپنی جہالت پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ جیسا کہ علم تجوید کا قاعدہ ہے، قراءت میں حروف مقطعات کے تمام حروف الگ الگ ادا کئے جاتے ہیں، یعنی "الم" کو الف - لام - میم پڑھا جائے گا۔ مذکورہ "الم" میں حرف میم تین بار آیا ہے: ایک حرف لام کے آخر میں اور دوسرا حرف میم کے شروع میں اور تیسرا حرف میم کے آخر میں۔ تجوید کے قاعدے سے یہاں پہلے میم پر تشدید ہے کیونکہ پہلے میم کو دوسرے میم سے ملا کر پڑھا جائے گا جس کو فن تجوید میں ادغام کہتے ہیں۔ البتہ تیسرا میم ساکن ہے یعنی اس پر کوئی تشدید نہیں ہے۔ اگر بفرض محال "الم" میں آخری میم پر تشدید بھی ہوتی تو اس سے اس کے معنی میں کوئی فرق نہیں پڑتا اور وہ حروف مقطعات کا ہی حصہ رہتا جو متشابہات میں شامل ہے اور جس کے حتمی معنی پر امت میں اتفاق نہیں ہے، اس لئے

یہاں خاموشی ہی بہتر ہے۔ اگر حضرت عمرؓ ”اَبّا“ اور ”ربا“ کے معنی نہیں جانتے تھے، تو اس سے ان کے ایمان میں کیا فرق پڑ گیا؟

اس نکتے کی مزید وضاحت کے لئے ہم نے ہندوستان کے معتبر ترین قراءت و تجوید کے استاد اور ماہر قاری ابوالحسن اعظمی (دیوبند) صاحب سے رجوع کیا تو انھوں نے پوری وضاحت کے ساتھ جواب دیا کہ جو بھی ”الم“ کی میم پر تشدید کا قائل ہے وہ جاہل اور علم قراءت سے نابلد ہے۔ انھوں نے مزید وضاحت فرمائی کہ، بلا استثناء، تمام حالات میں حروف مقطعات کا آخری حرف ساکن ہوتا ہے۔

یہاں یہ سوال اٹھتا ہے کہ کیا اسرار عالم کو وہ علمی صلاحیت اور فنی استعداد حاصل ہے جو اس طرح کے نازک مسائل پر رائے زنی کے لیے ضروری ہے۔ ہم نے دلی میں اسرار عالم کے حلقے کے کچھ لوگوں سے ان کے تعلیمی بیک گراؤنڈ اور عربی زبان سے ان کی واقفیت کے بارے میں وہاٹسیپ پیغام کے ذریعے استفسار کیا لیکن کسی نے جواب نہیں دیا حالانکہ ان تمام لوگوں سے ہماری ذاتی جان پہچان ہے۔ بالآخر ایک صاحب کی وساطت سے ایک دوسرے شخص نے بتایا کہ اسرار عالم الہ آباد یونیورسٹی سے گریجویٹ ہیں (شاید سوشل سائنسز میں)۔ گریجویشن کے بعد ان کو بہار حکومت کی ملازمت مل گئی لیکن وہ وہاں جاری کرپشن سے سمجھوتہ نہیں کر سکے اور اپنے خاندان کی مخالفت کے باوجود استعفی دے دیا۔ اس کے بعد ان کو جماعت اسلامی کی تنظیم طلبہ SIO میں جگہ دی گئی لیکن وہ وہاں نہیں ٹک سکے۔ پھر ان کو ریڈئنس میں ادارتی ذمہ داری دی گئی لیکن وہاں بھی وہ اپنی شاذ آراء کی وجہ سے ریڈئنس کے ایڈیٹر محمد یوسف مرحوم سے ٹکراتے رہے اور بالآخر وہاں سے بھی استعفی دے دیا اور تب سے گھر سے لکھنے پڑھنے کا کام کرتے ہیں۔ اس عرصے میں کچھ لوگوں نے ان کی مالی امداد بھی کی۔ ان حالات میں انھوں بعض فارغین مدارس سے عربی زبان بھی سیکھی۔ واضح ہے کہ اس بیک گراؤنڈ کے ساتھ اسرار عالم کو ان مسائل پر ہاتھ نہیں ڈالنا چاہئے تھا جس کی انھوں نے کوشش کی۔

آخری بات: جو عظیم، تاریخی اور عبقری کام حضرت عثمانؓ نے المصحف الامام تیار کر کے انجام دیا تھا، اگر ویسا ہی کام حدیث پاک کی مستند اور حتمی تدوین کرا کر اوائل اسلام کے کسی خلیفہ نے ایک ماسٹر کاپی جاری کر دی ہوتی تو امت پر بڑا احسان ہوتا اور ہم آج رائج سینکڑوں مجموعہ ہائے حدیث سے بچ جاتے اور امت میں اختلاف بھی کم ہو جاتا۔ اب یہ کام کوئی نہیں کر سکتا ہے۔ ترکی حکومت کے مذہبی ادارے (دیانت) کی اس سلسلے میں کوشش ناکام ہو گئی۔

اخبار علمیہ

ہیپسبرگ شاہی خاندان نے اسلاموفوبیا کی بنیاد رکھی

ترکی مؤرخ گوک ہان گوچک نے استنبول کے روزنامہ "ینی شفق" میں شائع ہونے والے اپنے ایک مضمون میں بتایا ہے کہ خلافت عثمانیہ سے معرکہ آرائی کی وجہ سے ہیپسبرگ شاہی خاندان نے یورپ میں اسلاموفوبیا (اسلام کا خوف) پھیلایا۔ ہیپسبرگ شاہی خاندان سوئیزرلینڈ سے تعلق رکھتا تھا لیکن اس نے مختلف حربوں سے دھیرے دھیرے یوروپ کے بڑے حصے پر قبضہ کرلیا تھا۔ ہیپسبرگ خاندان کے بادشاہ روڈولف اول نے ۱۲۴۰ء میں اپنی بادشاہت کی حدود میں توسیع کرنے کا کام شروع کیا۔ یوں اس شاہی خاندان نے جلد ہی جرمنی، اسپین، آسٹریا اور رومی سلطنت کے علاقوں پر قبضہ کرلیا۔ جلد ہی اس کی سلطنت عثمانیہ سے لڑائی شروع ہوگئی۔ اس طویل لڑائی کے دوران اس شاہی خاندان نے عثمانیوں کو یوروپ اور عیسائیت کے لئے سب سے بڑے خطرے کے طور پر پیش کیا۔ یہ پروپیگنڈا دھیرے دھیرے اسلاموفوبیا میں بدل گیا جو یوروپ میں ایک طاقتور نظریہ کے طور پر آج بھی موجود ہے۔ ہیپسبرگ خاندان خود کو کیتھولک عیسائیت کا محافظ سمجھتا تھا جبکہ ترکیوں کو پروٹسٹنٹ یعنی باغی عیسائیوں کا حامی سمجھا جاتا تھا۔ ہیپسبرگ پروپیگنڈے نے عثمانیوں کو "مشرق سے آنے والے کافر" کے طور پر یوروپ میں متعارف کرایا۔

جب عثمانی فوج اور ہیپسبرگ شہنشاہیت کے درمیان ۱۵۹۱ء میں پندرہ سالہ طویل جنگ شروع ہوئی تو یوروپ میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں اور چرچوں میں "وحشی ترکوں" کے خلاف دعائیں مانگی جانے لگیں۔ شاہان ہیپسبرگ نے یوروپ میں مشہور کیا کہ اگر عثمانی اس کی حدود میں داخل ہوگئے تو یوروپ کا کوئی حصہ ان سے نہیں بچ سکے گا۔ یوں "عثمانی خطرہ" ہیپسبرگ شاہی خاندان کے ہاتھ میں ایک سیاسی ہتھیار بن گیا جس نے یوروپ کے مزید علاقوں پر اس کے قبضے میں مدد کی۔

ترکی مؤرخ کے تجزیے کے مطابق، اٹھارویں صدی کے آتے آتے مسئلہ صرف دو بادشاہتوں کے ٹکراؤ کا نہیں رہ گیا تھا بلکہ وہ مسلم مشرق اور عیسائی مغرب کے درمیان کشمکش کا عنوان بن گیا۔ اس پروپیگنڈے میں ترکیوں کو غیر مہذب اور عیسائیت دشمن کے طور پر پیش کیا گیا۔ اس کے لئے شعر وادب اور ناول کا سہارا لیا گیا۔ اس دشمنی کو استعمال کرکے ہیپسبرگ خاندان بلقان تک پر قابض ہوگیا۔ مزید برآں اس پروپیگنڈے کی وجہ سے ہیپسبرگ شاہی خاندان کے لئے افریقہ، شمالی وجنوبی امریکا اور ہندوستان کے بعض علاقوں پر قبضہ اور استحصال آسان ہوگیا۔ آج بھی اسلاموفوبیا پوری قوت سے باقی ہے او مغرب کے توسیع پسندانہ پلان میں اس کا مددگار ہے۔ (الجزیرہ، ۲۰ر نومبر ۲۰۲۵۔ ترجمہ و تلخیص: ظفر الاسلام خان)

تبصرۂ کتب

پروفیسر عبد الرحیم قدوائی، قرآن کے ترجمے کی کوشش: قرآن کے ۱۲۰/ انگریزی ترجموں کا جائزہ (انگریزی)، مرتب: ابراہیم خان، خلیق احمد نظامی سنٹر برائے قرآنی اسٹڈیز، علی گڑھ یونیورسٹی، سنہ اشاعت ندارد [۲۰۲۵]، صفحات: ۵۳۶۔

Prof. Abdur Raheem Kidwai, *Towards Translating The Quran: Assessment of 120 English translations of the Quran.*

یہ کتاب پروفیسر عبد الرحیم قدوائی کے قرآن پاک کے انگریزی ترجموں کے تبصروں پر مشتمل ہے۔ یہ تبصرے پچھلے دو، تین دہائیوں کے درمیان شائع ہوئے اور زیادہ تر پہلے مسلم ورلڈ بک ریویو (لیسٹر، برطانیہ) میں شائع ہوئے۔ اس کتاب میں ۱۲۰/ انگریزی ترجموں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ قرآن پاک کے انگریزی ترجموں پر تقابلی نظر رکھنے والوں میں پروفیسر عبد الرحیم قدوائی دنیا بھر میں ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں۔

مصنف نے مقالات کو ان اجزاء میں تقسیم کیا ہے: مسلمانوں کے ترجمے: ۷۸ ترجمے (سنی مسلمان ہونا چاہیے تھا)؛ شیعہ مسلمان: ۱۲ ترجمے؛ قادیانی: ۷ ترجمے؛ مستشرقین: ۱۵ ترجمے۔ اس کے علاوہ ۸ ”دوسروں“ (others) کے ترجمے ہیں جن میں نام کے لحاظ سے زیادہ تر مسلمان نظر آرہے ہیں۔

ان ترجموں کی ایک ترتیب وہ بھی ہوسکتی ہے جو تفاسیر میں ملحوظ ہے۔ تفاسیر کو بالعموم ان خانوں میں تقسیم کیا گیا ہے:

۱. تفسیر بالمأثور (قرآن، حدیث، سنت، صحابہ کے اقوال کی روشنی میں) مثلا: طبری، جامع البیان؛ ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم۔
۲. تفسیر بالرأی (یعنی عقل سے اجتہاد کرنا): البیضاوی، تفسیر انوار التنزیل؛ الرازی، مفتاح الغیب۔
۳. حرفی تفسیر (خوارج): قرآن کی عمومی تعلیمات کے برخلاف کسی آیت پر حرفی طریقے سے عمل کرنا۔ خارجی، ظاہری اور سلفی تفاسیر اسی دائرے میں آتی ہیں۔

۴. اصولی تفسیر (صوفی): احمد بن عجیبہ، البحر المدید فی تفسیر القرآن المجید؛ القشیری، لطائف الاشارات؛ سہل التستری، تفسیر القرآن الکریم؛ ابن العربی، تفسیر القرآن الکریم۔

۵. شیعہ تفسیر: العیاشی، تفسیر العیاشی؛ الطوسی، تفسیر التبیان؛ الطبرسی، تفسیر مجمع البحرین۔

مصنف نے دکھایا ہے کہ بعض ترجمے محض سرقہ ہیں اور عبداللہ یوسف علی یا پکتھال سے چوری کیے گئے ہیں جیسے *Majestic Quran* (۲۰۰۰) میں زیادہ تر بغیر ذکر کیے عبداللہ یوسف علی اور پکتھال کے ترجموں سے نقل کیا گیا ہے۔ سید وقار احمد کا ترجمہ (۲۰۰۵) بڑی حد تک عبداللہ یوسف علی کا سرقہ ہے۔ لیلی بختیار (۲۰۰۷) نے بڑی حد تک اے-جے-آربری کے ترجمے پر ہاتھ صاف کیا ہے۔ ایم شریف چودھری (۲۰۱۰) نے زیادہ تر پکتھال کے ترجمے پر انحصار کیا ہے۔ پیچی اور جہینی (۲۰۱۲) نے بھی پکتھال پر انحصار کیا ہے جبکہ جبوری (۲۰۱۴) نے بڑی حد تک عبداللہ یوسف علی کے ترجمے پر اعتماد کیا ہے۔

قرآن پاک سے متعلق مطالعات میں یہ ضروری تھا کہ مستشرقین کے دعوے کا، کہ اسلام یہودی وعیسائی کتابوں کا چربہ ہے، اچھی طرح سے جائزہ لیا جائے۔ راقم نے اپنے ترجمۂ قرآن پاک (*Glorious Quran*) میں نمونے کے طور پر توریت اور قرآن پاک سے صرف ۳۵ مثالیں دی ہیں جہاں قرآنی بیانیہ narrative توریت سے بالکل مختلف ہے۔ پروفیسر عبدالرحیم قدوائی نے اپنے ایک حالیہ مضمون (معارف، دسمبر ۲۰۲۵) میں قرآن پاک اور عہد جدید (اناجیل) میں حضرت مریم علیہا السلام کی تصویر کشی portrayal کا موازنہ کر کے دکھایا ہے کہ کس طرح قرآن حضرت مریم کا تفصیل سے اور بڑی عزت کے ساتھ تذکرہ کرتا ہے جبکہ عہد جدید میں کہیں کہیں ان کے نام کا ذکر کرنا بھی ضروری نہیں سمجھا گیا۔ اس پر مزید کام کرنے کی ضرورت ہے۔ میرے خیال میں محنت کرنے سے ہمیں ہزاروں ایسی مثالیں ملیں گی جن میں قرآن پاک کا بیانیہ بائبل (عہد قدیم وجدید) سے مختلف ہے۔

(ظفر الاسلام خان)

پروفیسر شریف حسین قاسمی، حاصل تحقیق، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات: ۴۴۸، قیمت: ۶۰۰ روپے، سن اشاعت: ۲۰۲۲ء، پتہ: غالب اکیڈمی، بستی حضرت نظام الدین، نئی دہلی ۱۳۔

ہندوستان میں فارسی زبان و ادب کے مطالعہ و تحقیق اور تدریس و تالیف کے تعلق سے اب جن چند ہستیوں کا نام زبان پر آجاتا ہے ان میں پروفیسر شریف حسین قاسمی کی شخصیت بھی ہے۔ ہندوستان میں فارسی ادب اور ہندوستانی فارسی ادب دونوں پر ان کی گہری نظر ہے۔ اور اس کا ایک ثبوت ان کے متعدد مضامین کا زیر نظر مجموعہ ہے۔ نام حاصل تحقیق ہے لیکن حاصل مطالعہ بھی کہا جاسکتا ہے۔ قریب تیس مضامین ہیں گویا یہ سی پارے ہیں۔ ان میں شروع کے بارہ پارے صرف غالب کے تحقیقی مطالعہ کے لیے خاص ہیں باقی، سعدی، مولانا ابوالکلام آزاد، علامہ اقبال، علامہ شبلی، خسرو، میر اور مولانائے روم، اور شاد وغیرہ کے حوالوں سے ہیں، ان مطالعات میں صرف اظہار تحقیق تک بات محدود رہتی تو بھی عنوان سے انصاف ہو جاتا لیکن قاسمی صاحب کا ذوق تنقید ان کے مزاج تحقیق سے جدا نہیں رہ سکتا۔ پہلے ہی مضمون جو عہد غالب کے فارسی ادب کی خصوصیات کے عنوان سے ہے۔ آغاز ہی اس احساس کے اظہار میں بدل جاتا ہے کہ غالب کے دور کا فارسی ادب اپنے گذشتہ ادوار کے مقابلے میں زیادہ وقیع اس لیے ہے کہ فارسی ادب کا شاید ہی کوئی پہلو ایسا ہو جس پر اس زمانہ کے شاعروں اور ادیبوں نے طبع آزمائی نہ کی ہو۔ غالب کے بعد اقبال کا ذکر ایسے واحد مفکر شاعر کے طور پر کیا گیا کہ اقبال نہ ہوتے تو ہندوستان میں فارسی ادب غالب کے ساتھ ہی ختم تھا۔ حالانکہ آگے ایک مضمون میں وہ علامہ شبلی کی شاعرانہ حیثیت پر لکھتے ہوئے ہر صنف شعر میں علامہ کی قادرالکلامی کا اعتراف کرتے ہیں اور یہ بھی بتاتے ہیں کہ اردو میں ۱۳۷۹/ اشعار کے مقابلے میں علامہ کے فارسی اشعار کی تعداد ۱۶۷۳ ہے۔ اس اظہار کمال کے باوجود غالب واقبال کے درمیان فارسی شاعری کے نہایت اہم شبلیانہ وجود کا عدم اعتراف، تحقیق ہی نہیں تنقید کے حامل کے کامل ہونے پر قاری کے زاویۂ نگاہ کی جانب اشارہ کا جواز پیش کرتا نظر آتا ہے۔ یہ تو محض ایک سخن گسترانہ خیال ہے ورنہ اس پہلے ہی مضمون میں انیسویں صدی کے نصف اول کے قریب سو شعرائے فارسی کی نشان دہی، واقعی تحقیق کا حاصل ہے۔ غالب فارسی کو اپنی ازلی دستگاہ سمجھتے تھے اس خیال کی تائید کے ساتھ یہ بھی کہا گیا کہ مومن خاں مومن کو فارسی میں وہ دستگاہ حاصل تھی کہ اہل ایران ان کو ایرانی سمجھتے تھے۔ صحیح ہونے کے باوجود مومن وغالب کا یہ موازنہ اس مضمون میں بظاہر غیر ضروری ہے۔ اسی مضمون میں اس بات

پر تعجب کا اظہار کیا گیا کہ غالب کے دور میں شمالی ہندوستان میں فارسی کی حکمرانی کے باوجود اس کا مستقبل خطرے میں تھا جب کہ جنوب ہند میں کرناٹک کے والا جاہی نوابوں کے ذریعہ فارسی کو نئی زندگی مل رہی تھی۔ لیکن کہا جاسکتا ہے کہ اس والا جاہی سرپرستی کے باوجود، فارسی کا مستقبل وہاں بھی روشن نہیں تھا۔ ایک اور دلچسپ مضمون، غالب کی خودستائی کے بیان میں ہے۔ اس میں امام غزالی کا یہ جملہ نقل کیا گیا کہ ”کوئی جماعت ایسی نہیں جس میں اتنا غرور ہو جتنا صوفیہ میں پایا جاتا ہے“۔ اس جملے کو چشم کشا لکھا گیا حالانکہ تعبیر محل نظر ہو سکتی ہے۔ غالب کی تعلی اور خودستائی کی طویل بحث کا خاتمہ یہ کہہ کر کیا گیا کہ مرزا نے کچھ بھی مبالغہ نہیں کیا بلکہ وہی کہا جو ان کے زمانے کے اہل نظر ان کی نسبت رائے رکھتے تھے۔ غالب کے فارسی کلام میں حضرت یوسفؑ کے قصہ کی بازگشت بھی دلچسپ مضمون ہے۔ اسی طرح مثنوی ابر گہر بار کے حوالے سے پیغمبر اسلامؐ کی شان میں غالب کے جذبات کی ترجمانی بہت پر اثر ہے۔ اس مثنوی کے محرکات میں فردوسی کے شاہنامہ اور نظامی کے سکندر نامہ کا ذکر کیا گیا کہ ان ہی کی بحروں میں غزوات نبویؐ کو نظم کرنے کا خیال غالب تھا۔ مضامین چونکہ الگ الگ مناسبتوں سے لکھے گئے اس لیے ان میں بیانیہ کی وحدت اور فکر کی یکسانی کی گنجائش نہیں رہتی۔ اسی لیے اس قسم کے خیالات بھی ملتے ہیں کہ ”غالب کس وقت کیا کہہ دیں، کچھ بھروسا نہیں۔ وہ حالات سے بہت جلد متاثر ہو جاتے ہیں اور ایسی باتیں کہہ دیتے ہیں جو وقتی ہوتی ہیں۔ ان کے عقائد و نظریات سے ان کا اکثر و بیشتر تعلق نہیں رہتا“۔ اور بھی مضامین ہیں جیسے حدائق الشعراء کا تعارف۔ اس میں ایک جگہ یہ بھی ہے کہ ”حدائق الشعراء اپنے مآخذ اور مراجع کے لحاظ سے بہت اہم ہے۔ اگر یہ تمام مراجع مولف کے پیش نظر رہتے“۔ یہ اجمال یا ابہام بہر حال وضاحت طلب تھا۔

البتہ حیات سعدی کی تعریف میں کوئی اجمال نہیں کھل کر لکھا گیا کہ جامعیت اور تنقیدی نقطۂ نظر اور تقابلی مطالعہ کے لحاظ سے یہ منفرد کتاب ہے۔ خود ایران میں سعدی پر ایسی کتاب نہیں لکھی گئی۔ تصوف کی ایک اہم کتاب فوائح العرفان کا تعارف بھی تذکرۂ صوفیہ کے شائقین کے لیے بے حد دلچسپ اور معلومات افزا ہے۔

ہر مضمون کا تعارف ممکن نہیں لیکن یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستانی فارسی ادب کے

موضوع کے لحاظ سے اس مجموعہ میں پورا انصاف کیا گیا ہے۔ فاضل مولف کا تدریسی لہجہ، ان کے تنقیدی اسلوب کو دوسروں سے جدا کرتا نظر آتا ہے۔ پیش لفظ میں پروفیسر نذیر احمد اور پروفیسر امیر حسن عابدی کے استثناء کے ساتھ معاصرین اہل قلم سے یہ شکوہ دلچسپ ہے کہ کسی نے ان مضامین کو کتابی شکل میں پیش کرنے کی بات نہیں کی۔ یہ شکوہ بجائے خود جواب شکوہ کا طلب گار نہیں۔ افسوس ہے کہ ایسی عمدہ کتاب کے ذکر کی نوبت ایک مدت بعد آئی۔ غیر ضروری کتابوں کی کثرت کا جبر، تعارف و تبصرہ کی دنیا کا ایک مسئلہ بنتا جاتا ہے۔ (محمد عمیر الصدیق ندوی)

مولانا عبد العلی فاروقی، کچھ یاد رہا، کچھ بھول گیا: متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع خوبصورت گرد پوش، صفحات ۲۴۸، قیمت ۳۰۰/ روپے، سال اشاعت ۲۰۲۵ء، پتہ: مکتبہ البدر کاکوری، لکھنؤ۔ یوپی۔ موبائل: ۹۴۵۰۱۱۰۴۶۳

مولانا عبد العلی فاروقی، اودھ کے نہایت مردم خیز قصبہ کاکوری کی علمی و مذہبی روایتوں کے معتبر سفیر ہی نہیں خوبصورت تصویر بھی ہیں۔ خالص علمی و فقہی اور کہنا چاہیے مناظراتی روایتیں ان کے دامن کو ان کے خاندانی بزرگوں کے طفیل میں پر ثروت کرتی رہیں۔ لیکن اودھ کی قصباتی لسانی اور ادبی فضا کا اثر کچھ اتنا زیادہ قبول کیا گیا کہ اب ان کی شناخت ایک خاص ادبی اسلوب والے کی بن گئی ہے۔ اس کا ثبوت ماہنامہ البدر کے ان کے اداریے، مضامین اور ان کی مردم شناسی کا جوہر لیے ہوئے تبسم آشنا تحریریں ہیں جن کو پڑھنے کی اگر توفیق ملتی رہے تو پھر یہ عادت کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔

پیش نظر کتاب کا عنوان ہی ان کے ادبی مزاج کا ترجمان بن گیا۔ زندگی نے یاد رکھنے اور نہ بھول پانے والی چند حکایتوں میں ان کو اپنا شریک اس طرح بنایا کہ یہ ہستی کی وہ حکایت بن گئی جو عموماً ابتدا و انتہا سے بے خبر ہو کر درمیان ہی سے سنی جاتی ہے۔ حکایتیں تو ہوتی ہی ہیں کچھ یاد رکھنے کے لیے اور زیادہ تر بھول جانے کے لیے ۔ جن کے لیے زندگی دل کا دوسرا نام یا پہچان ہے۔ وہ تو وصیت ہی کر جاتے ہیں کہ یادوں سے باز آیا ورنہ یہ زندگی جی سے بھلائی نہیں جا سکتی۔ فاضل مصنف کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ پیش آیا کہ کچھ یاد رہا اور کچھ بھولنے یا بھلا دینے کے عمل کی نذر ہو گیا۔ لیکن جو یاد رہا وہ واقعی یاد رکھنے کے لائق تھا۔ پانچ چھ برس کی عمر کے بچے کے سر پر مولانا حسین احمد مدنی کا ہاتھ اور عمر و علم و عمل کی برکت کی دعا کیسے بھلائی جا سکتی ہے۔

بچپن کی یادیں، تعلیمی زندگی کی چہل پہل، والدین، اساتذہ پھر زندگی کے اپنے تقاضوں کی

تفصیل اور پھر سب کا ماحصل کہ جو ملا وہ حیثیت سے سوا ملا۔ زندگی کے سفر میں شخصیتوں سے تعارف اور ملاقات اور پھر تعلق و موالات کے قصے سب ناگزیر ہیں، جن کا ماحصل عموماً مضمون کی اس سرخی میں بدل جاتا ہے کہ:

زندگی عمر بھر اداس رہی

یہی نامعلوم سی اداسی اپنے اظہار کے لیے تجربات جیسے لفظوں کا سہارا لیتی ہے اور پھر ساری داستان وہیں آکر تمام ہو جاتی ہے کہ نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم۔

یہی سب کچھ اس کتاب میں ہے، نیا کچھ بھی نہیں ،نام و مقام کے بدلنے سے سچائیاں کب بدلتی ہیں؟ لیکن حکایات سننے میں سنانے والے کی زبان، اس کا لہجہ، اس کا زیر لب تبسم، ٹھنڈی اور کبھی گہری آہیں اور کبھی اپنی ہی نظروں کے تعاقب میں سرگرداں آنکھیں، یہ سب خود سننے والے کو زندگی سمجھنے کے عمل میں شریک کر لیتی ہیں۔اس کتاب کے مطالعہ میں زبان و بیان کی اور لطافت اور بیان واقعہ میں سادگی اور بے تکلفی ہی اس کو جداگانہ حیثیت دیتی ہے۔ احمد ابراہیم علوی نے مزے کی بات کہی کہ ہم مجبوراً تعریف کررہے ہیں ،واقعی مولانا کی تحریر پرکشش، دل نشین، قابل تحسین ہے۔

فاضل مصنف نے یادوں کی اس دنیا کو آپ بیتی کہنے سے احتراز ہی نہیں، انکار کیا ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ یہ اس قسم کی آپ بیتی ہے جو جگ بیتی سے دور دور رہنے کی شعوری کوشش کرتی ہے۔اس قسم کی تحریروں کے دلچسپ ہونے میں کیا شبہ، لیکن تجربات و حوادث کی شکل میں دنیا جو دیتی ہے اس کی افادیت سے بھی یہ خالی نہیں۔ باقی اصل افادیت تو ٹائٹل پر موجود اس حرف حقیقت سے عیاں ہے کہ وذکر فان الذکری تنفع المؤمنین۔ (ع۔ص)

فرحان بارہ بنکوی ،تذکرہ اسلاف بارہ بنکی، مجلد، صفحات:۳۲۰، پرویز بک سیلر، بارہ بنکی، ۲۰۲۴ء، قیمت:۴۵۰روپے۔ موبائل:۹۹۳۵۴۹۹۹۸۳۔

بارہ بنکی صدیوں سے صاحبان فضل و کمال کا مسکن رہا ہے، لیکن اس کی تاریخ پر ۱۹۸۴ء میں علی محمد زیدی چودھری سید کی ۱۵۵ صفحات پر مشتمل "بارہ بنکی" نامی مختصر کتاب کے سوا کوئی دوسری کتاب نظر سے نہیں گذری۔ اس کے بعد اب زیر نظر کتاب منظر عام پر آئی ہے جس میں بارہ بنکی کے اسلاف کے متعلق مستند معلومات فراہم کر کے اس کمی کی بہت حد تک تلافی کی گئی ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ مصنّف نے ان علاقوں کی شخصیات کو بھی اس میں شامل کیا ہے جو

موجودہ تقسیم کے لحاظ سے اب ضلع بارہ بنکی میں شامل نہیں ہیں مگر پہلے اسی علاقے میں شمار ہوتے تھے جیسے ردولی وغیرہ اور صحیح بات یہ ہے کہ اگر ردولی اور بعض قدیم قصبات کو اس سے الگ کر دیا جائے تو بارہ بنکی کی تاریخی اور دینی عظمت کو وہ مقام کہاں حاصل ہو پائے گا جو ان کی شمولیت سے برقرار ہے۔

کتاب کے چار حصوں میں پانچویں سے پندرہویں صدی ہجری تک کی کل ۱۷۰؍شخصیات کے حالات کا استقصاء کیا گیا ہے۔ اس سے بارہ بنکی کی ہر صدی کی نمایاں شخصیتوں کا ایک تسلسل کے ساتھ علم ہو جاتا ہے، دوسرے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ خطہ تقریباً ایک ہزار سالہ تاریخ میں علم وفضل کے آفتاب وماہتاب سے کبھی خالی نہیں رہا۔ کتاب کا پہلا حصہ، پانچویں سے پندرہویں صدی ہجری کے صوفیہ سید سالار ستر کھی، خواجہ غیاث الدین فتح پوری، شیخ احمد عبدالحق ردولوی وغیرہ، دوسرا، نویں صدی سے پندرہویں صدی ہجری کے علماء وقضاۃ شیخ شہاب الدین اودھی، قاضی حماد ردولوی، ملاقطب الدین سہالوی وغیرہ، تیسرا، تیرہویں سے پندرہویں صدی ہجری کے شعراء وادباء چرکین ردولوی، اخگر بارہ بنکوی، اسرارالحق مجاز وغیرہ اور چوتھا، چودھویں وپندرہویں صدی ہجری کی ملی، سماجی وسیاسی شخصیات سید احمد موسوی، رفیع احمد قدوائی، جسٹس سید کرامت حسین، ڈاکٹر اخلاق الرحمن قدوائی اور پروفیسر مشیرالحسن وغیرہ کے سوانح اور علمی، ادبی، ملی اور سیاسی کارہائے نمایاں کی تفصیل پر مشتمل ہے۔

اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ مصنّف نے کتاب کی تالیف وتدوین میں بڑی محنت کی ہے۔ ان کا یہ احساس ایک حد تک بجا ہے کہ مؤرخین نے بالعموم اس اہم خطے سے چشم پوشی کی۔ حالات کے ذکر میں اجمال وایجاز اور عبارتوں میں حشو وزوائد کے پہلو کو خاص طور پر پیش نظر رکھا گیا ہے۔ ایسے اشخاص بھی اس تذکرے میں شامل ہیں جو خود یا ان کے اہل خانہ کہیں اور سے آکر یہاں ایک عرصے سے سکونت پذیر ہیں مثلاً کیف اعظمی اور اظہر بہرائچی وغیرہ۔ ان کے پیش نظر درجنوں مصادر کی فہرست میں اس موضوع پر لکھی جانے والی مذکورہ بالا پہلی تصنیف "بارہ بنکی" نظر نہیں آئی۔ اس کے علاوہ اس علاقے کے بعض نامور اشخاص مثلاً دارالمصنّفین سے باقاعدہ رسمی طور پر وابستہ فضلاء مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا مسعود علی ندوی اور مولانا عبدالباری ندوی کا ذکر ہے لیکن سابق ناظم دارالمصنفین مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی ردولوی اور اسی خطے کے پروفیسر

خورشید احمد نعمانی ردولوی کا ذکر نہیں ہے۔ ص ۲۸۵-۲۸۶ پر جسٹس سید کرامت حسین کا ذکر ہے۔ ان کے حالات میں اس کا تذکرہ ہونا چاہئے تھا کہ وہ دارالمصنفین کے پہلے نائب صدر تھے اوراس کی ترقی و فروغ کے سلسلے میں مشورے دیتے تھے۔ ان معمولی فروگذاشتوں کے باوجود کتاب اپنے موضوع پر مفید اور مطالعے کے لائق ہے۔ (کلیم صفات اصلاحی)

ڈاکٹر شاداب ذکی بدایونی، خوشبوئے مدینہ، ترتیب کار: کامیاب ذکی، مجلد، صفحات ۱۳۶، ذکی منزل، محلہ سوتھا، بدایوں ۲۰۲۴ء، قیمت: ۵۰۰روپے، موبائل: ۹۵۵۷۷۵۳۶۲۵۔

ڈاکٹر شاداب ذکی کا تعلق گہوارۂ علم وادب بدایوں سے ہے۔ انہوں نے اس سے قبل تذکرہ غیر مسلم شعرائے بدایوں اور تذکرہ شاعرات روہیل کھنڈ تصنیف کر کے تذکرہ وسوانح اور شعر وادب کے میدان میں قابل قدر خدمت انجام دی ہے۔ بعد میں نثر کے بجائے انہوں نے عنان توجہ تقدیسی بالخصوص نعتیہ شاعری کی طرف موڑدی اور حمد ونعت اور منقبت کے متعدد مجموعے للہ الحمد، رب کے حضور، ثنائے رب کریم، سرکار کی باتیں وغیرہ منظر عام پر آئے۔ زیر نظر کتاب ان کی عمدہ نعتوں کا مجموعہ ہے۔

اس مجموعۂ نعت میں شاعر نے پہلے بجاطور پر خالق "رحمۃٌ للعالمین" کی حمد وثناء کی ہے۔ اس کے بعد سرورکائنات کی مدح وتوصیف اوران سے عقیدت ومحبت کے جام انڈیلے ہیں۔ یاد محمدؐ کا چراغ ان کی فکر ونظر کی گلیوں میں روشن ہے ہی۔ وہ چاہتے ہیں کہ امت محمدیہ کا ہر فرد اسی یاد سے یاری کرلے تاکہ فلاح ونجات کی راہ اسے نصیب ہوجائے۔

کتاب نعت "خوشبوئے مدینہ" نذر کرتا ہوں الٰہی سب کو ہو محسوس اس عنوان کی خوشبو
نہ کیوں ہندی غلاموں کو خوشی ہو یہ خبر سن کر کہ آقا کو ہوئی محسوس ہندوستان کی خوشبو

ان کے نعتیہ اشعار کی سب سے بڑی خوبی سادہ بیانی اور اسلوب کی دلکشی ہے۔ زبان عام فہم ہے۔ تعبیریں آسان اختیار کی گئی ہیں۔ اشارہ وکنایہ سے بھی بہت کام نہیں لیا گیا ہے۔ آٹھ یا دس اشعار پر مشتمل ہر نعت کے پہلے شعر کو فہرست میں عنوان بنایا گیا ہے۔ ہر نعت کی پیشانی پر "صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم" لکھا گیا ہے تاکہ قاری پہلے بارگاہ رسالت میں درود کا نذرانہ پیش کردے، اس کے بعد آپؐ کے متعلق شاعر کے احساسات وجذبات اور خیالات سے آشنا ہو۔ اچھی بات یہ ہے کہ شاعر نے حمد ونعت کا باریک فرق بڑی ہوشیاری سے ملحوظ رکھا ہے۔ عقیدت میں غلو کی مثالیں بھی نظر نہیں آئیں۔ یہی وجہ ہے کہ

ان کے نعتیہ اشعار کا پیامیہ اور عملی پہلو بہ طور خاص نمایاں ہے۔ درج ذیل اشعار دیکھیں:

نبی کے چاہنے والوں کے چاہے سر قلم کر دو　　نہیں دبتے ہیں باطل سے،نہ ہی پھرتے ہیں ایماں سے
نبی کے حکم کے آگے سرِ تسلیم خم کر دو　　بھلا اس میں تمہارا ہے، بقا اس میں تمہاری ہے

ایک مسلمان کی زندگی محض قول کا نہیں عمل کا نمونہ ہوتی ہے۔اس کے اخلاق وعادات میں دوسروں کے لیے کشش اس وقت پیدا ہوتی ہے جب وہ صحیح معنوں میں حضور پاکؐ کی ایک ایک سنت کے لیے اپنے آپ کو وقف کرنے کا جذبہ اپنے دل میں رکھتا ہے۔شاعر اخلاق اسلامی کے اس نکتے سے بخوبی آشنا ہیں۔ان کے اعمال خیر میں نعتوں کا وہ مجموعہ بھی ہے جس کو وہ لے کر رب کی بارگاہ میں حاضر ہو چکے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ اے رب کائنات! میں نے اپنی حیات مستعار کے لمحات، اور کاموں کے ساتھ تیرے رسول کی سیرت کو عام کرنے کی سعی میں بھی صرف کیے ہیں تو اس خدمت کو قبول کر لے۔شاعر کا عزم دیکھیں کہ اس نے خود کو مخاطب کر کے سیرت پر عمل کا پیغام کس قدر دوٹوک اور واضح انداز میں دینے کی کوشش کی ہے:

اسی ڈگر پر چلا کریں گے، یہ طے کیا ہے　　دکھائی ہم کو جو راہ حق ہے، حبیب رب نے
نبی کی سیرت پڑھا کریں گے، یہ طے کیا ہے　　ہے زندگی کے لیے ضروری جو،سب ہے اس میں
غلامی کا حق ادا کریں گے، یہ طے کیا ہے　　سبق صحابہ کی زندگی سے ضرور لے کر

نعت خوانی کے مشغلے کو انہوں نے کیوں اپنایا ہے اس کا منظوم جواب سن لیجئے:

سکون قلب کی خاطر میں اکثر نعت کہتا ہوں　　کبھی دن میں کبھی راتوں کو اٹھ کر نعت کہتا ہوں
اسی سے بس سمجھ لیجے کہ کیونکر نعت کہتا ہوں　　غلامی کا ادا کرنے کا حق شاداب کوشش ہے

اس مجموعے سے شاداب ذکی کی اسلامی تاریخ کے اہم واقعات و شخصیات سے واقفیت کے ساتھ ساتھ ان کے ذوق نعت گوئی، نعتیہ شاعری میں ان کی مہارت، نکتہ سنجی اور خوش فکری پر روشنی پڑتی ہے۔نعتیہ ادب میں یہ مجموعہ یقیناً گراں قدر اضافہ ہے۔　　(ک،ص اصلاحی)

الحلّ المدلّل علی الدارمی من النصف الاوّل لمولانا الحافظ شاہ محمد نعیم عطا، باہتمام: ا. د سید ظہیر حسین جعفری، استاذ سابق فی قسم التاریخ بجامعۃ دلھی، صفحات: ۴۱۹، نشر بمدیریۃ رای بریلی، الطبعۃ الأولیٰ: ۲۰۲۴م، جوّال: ۹۵۵۵۴۵۰۲۳۹

''سنن دارمی'' یا ''مسند دارمی'' حدیث کی مشہور کتابوں میں سے ایک ہے۔اسے امام دارمی (م: ۸۶۹ء) نے فقہی ابواب کے انداز پر ترتیب دیا ہے،اسی بنا پر اسے سنن کہا جاتا ہے۔

اس کتاب کی ابتدا ایک طویل مقدمہ سے ہوئی ہے جس میں شمائل نبوی ﷺ، اتباع سنت، آدابِ فتویٰ، اور علم و اہل علم کی فضیلت وغیرہ پر روشنی ڈالی گئی ہے اور پھر عام ترتیب کے مطابق اس کا آغاز کتاب الطہارۃ سے ہوا ہے۔

امام عراقی نے النکت میں لکھا ہے کہ سنن دارمی کا نام مسند سے مشہور ہوا۔ ابن حجر کے نزدیک یہ کتاب دوسری کتب سنن سے مرتبے میں کم نہیں ہے اور اگر اسے کتب ستہ کی لسٹ میں شامل کر لیا جاتا تو ابن ماجہ سے مرتبے میں بہتر ہوتی۔

شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ نے لکھا ہے کہ بعض اہل علم اسے کتب ستہ میں شمار کرنا زیادہ مناسب سمجھتے ہیں کیوں کہ اس کے رجال کم ضعیف ہیں اور اس میں منکر و شاذ حدیثیں نادر ہی ہیں، اس کی اسناد عالی ہیں، اور اس کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ثلاثی اسناد صحیح بخاری کی ثلاثیات سے تعداد میں زیادہ ہیں۔

زیر تبصرہ عربی کتاب کے شارح حافظ شاہ نعیم عطا محدث ہیں۔ اس کے مرتب شاہ احمد حسین جعفری نعیمی اصلاحی ہیں۔ اس کتاب پر تعلیق پروفیسر نعمان خان سابق پروفیسر عربی دہلی یونیورسٹی نے لکھی ہے۔ پروفیسر نعمان خان لکھتے ہیں کہ یہ اہم کتاب ایک زمانہ دراز سے علمائے حدیث کی پہنچ سے باہر تھی۔ اسے کسی مقام پر حدیث کے درس کی طرح پڑھنے پڑھانے کا عام رواج نہیں تھا، بلکہ بعض علمائے حدیث کے حلقے تک یہ کتاب خاص ہو کر رہ گئی تھی (ص۹)۔ اس کتاب پر ایک بسیط مقدمہ ڈاکٹر سید ظہیر حسین جعفری پروفیسر دہلی یونیورسٹی نے انگریزی میں لکھا تھا، اس کی تعریب ڈاکٹر عبد الملک رسول پوری نے کی ہے۔

یہ شرح سنن الدارمی کے نصف حصہ کی منتخب احادیث پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کا درس خانقاہ کریمیہ سلون میں ہوتا تھا۔ اس شرح کو انوار محمد پریس لکھنؤ نے ۱۳۲۲ھ میں شائع کیا تھا۔ شارح نے اس کا نام "الحلّ المدلّل علی الدارمی من النصف الاوّل" رکھا تھا۔ یہ کتاب پہلی بار نظامی پریس کان پور سے ۱۸۷۶ء میں شائع ہوئی۔ دوسری بار حیدرآباد سے ۱۸۹۱ء میں اور تیسری بار مطبع رحمانی سے ۱۹۲۰ء میں شائع ہوئی۔ شیخ محمد احمد دھمان نے اسے ۱۹۳۰ء میں دار احیاء السنۃ النبویۃ قاہرہ سے شائع کرایا۔ اسی آخری[۱] اشاعت کا چلن عرب وہند میں عام ہوا تھا۔ اس کتاب کو

---

[۱] اس کتاب کا ایک ایڈیشن سعودی عرب میں ۲۰۰۰ء میں شائع ہوا۔ اس کی مختصر معلومات درج ذیل ہیں:
الکتاب: مسند الدارمي المعروف بہ (سنن الدارمي)

ہندوستان میں پہلی بار نواب صدیق حسن خاں قنوجیؒ مکہ سے ۱۸۹۰ء میں لائے تھے (ص۹)۔

اب اس شرح کے اندازِ تحریر کے چند نمونے پیش ہیں، تاکہ اس کی اہمیت و معنویت معلوم ہو سکے۔ "کتاب الطہارۃ" میں پہلے ایک باب "بابُ فرض الوضوء والصلاۃ" قائم کیا گیا ہے۔ اس کے بعد ایک طویل حدیث لائی گئی ہے۔ اور حدیث کے خاتمے پر اس حدیث کی حیثیت بتائی گئی ہے: اسنادہ صحیح والحدیث متفق علیہ[۲]۔ اس کے بعد اس حدیث کا حوالہ دیا گیا ہے۔ اس کے بعد ایک ذیلی عنوان قائم کرکے اس حدیث کی مختصر تشریح کی گئی ہے۔ اس کے بعد ایک دوسری حدیث لائی گئی ہے اور اسی انداز میں اس کی شرح کی گئی ہے۔

اسی ضمن میں آگے "باب فی البول قائما" کے تحت یہ حدیث لائی گئی ہے: جاء رسول اللہ ﷺ الیٰ سباطۃ قوم، فبال وھو قائم۔ قال ابو محمّد: لاأعلم فیہ کراھۃ۔ (تعلیق المحقق): اسنادہ صحیح۔

اس کی شرح کرتے ہوئے کتاب کے شارح نے لکھا ہے کہ نسائی شریف میں یہ حدیث فی باب الرخصۃ فی البول فی الصحراء قائما کے تحت آئی ہے۔ اور آخر میں اس حدیث کی یہ تاویل کی ہے گھر میں پیشاب بیٹھ کیا جائے اور صحرا میں کھڑے ہو کر کرنے کی گنجائش ہے۔[۳] کتاب کے شارح اس مذکورہ حدیث کی توجیہ ان الفاظ میں کرتے ہیں: ھذا ما خطر ببالی فی دفع تعارض حدیثی النھی والرخصۃ۔ ویمکن أن یقال فی توجیھہ إنّ روایۃ البول قائما، محمولۃ علیٰ أنہ کان لعذر یضطرّ الیہ۔[۴] (کھڑے ہو کر پیشاب کرنا حالت مجبوری میں تو جائز ہے، لیکن عام حالت میں مکروہ ہے۔ یہی توجیہ زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے۔ کیوں کہ صحرا میں کھڑے ہو کر پیشاب کرنے میں پیشاب کے چھینٹے سے بچنا محال ہے)۔ ایک اور صحیح حدیث میں پیشاب کے چھینٹے سے نہ بچنے پر عذاب قبر کی سخت وعید موجود ہے۔

(فضل الرحمن اصلاحی)

المؤلف: أبو محمد عبد اللہ بن عبد الرحمن بن الفضل بن بَھرام بن عبد الصمد الدارمي التميمي السمرقندي (المتوفی: ۲۵۵ھ)
تحقیق: حسین سلیم أسد الدارانی
الناشر: دار المغني للنشر والتوزيع، المملكة العربية السعودية
الطبعة: الأولی، ۱۴۱۲ھ - ۲۰۰۰م۔ عدد الأجزاء: ۴

[۲] الدارمی ۱/ ۵۱۳، ونظامی ۸۷

[۳] ماخذ سابق، ص ۱۲۸

[۴] ماخذ سابق، ص ۱۲۸

ادبیات

ہم نے مدینہ دیکھا

ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی
گوشۂ مطالعاتِ نعت، علی گڑھ

خوش نصیبی کا کھلا ہم نے تماشا دیکھا — جاگتی آنکھوں سے سرکارؐ کا روضہ دیکھا
دل کی آنکھوں سے جسے دیکھا کیے برسوں سے — سر کی آنکھوں سے بھی وہ گنبدِ خضرا دیکھا
شکرِ خالق، کہ نہ تھی پانو میں چلنے کی سکت — ہند سے اڑ کے گیے اور مدینہ دیکھا
وصف سنتے رہے ہم نصف صدی سے جس کا — جا کے خود آنکھوں سے اپنی وہ نظارہ دیکھا
ماضی کے خواب کی تعبیر تھی سب پیش نظر — کیا بتائیں تمھیں کس طور سے اور کیا دیکھا
تا کہ یہ آنکھیں وہاں دید کے قابل ہو جائیں — کعبے کو دیکھنے سے پہلے مدینہ دیکھا
پھر کسی شہر کو خواہش نہ رہی دیکھنے کی — دیکھ کے طیبہ کو جب خانۂ کعبہ دیکھا
یہاں روضے کی زیارت، وہاں کعبے کا طواف — آنکھوں میں کھبتا ہوا دونوں کا نقشہ دیکھا
روشنی روشنی اور کچھ بھی نہیں اس کے سوا — دونوں جا آٹھوں پہر نور برستا دیکھا
گلشنِ خلد بھی خود رشک کناں ہو جس پر — ہم نے جنت کا مدینے میں وہ ٹکڑا دیکھا
میری آنکھوں سے جو دیکھو تو سمجھ پاؤ گے — اہل دل نے وہاں کن آنکھوں سے کیا کیا دیکھا
خواب میں بھی نہ کسی کو نظر آیا شاید — آپؐ کی آنکھوں نے جو کچھ شبِ اسرا دیکھا
کعبے سے اقصیٰ گیے، اقصیٰ سے بالائے فلک — آگے سدرہ سے گیے عرشِ معلّٰی دیکھا
ہم کلامی سے شرف یاب ہوئے خالق کی — عرش پر مالک کونین کا جلوہ دیکھا
اللہ اللہ، یہ خوش خواہی صدیق و عمر — بعد رحلت بھی قریب آپؐ کے سوتا دیکھا
بعدِ صدیق و عمر رتبۂ عثمان و علی — سرورِ پاکؐ کے اصحاب میں بالا دیکھا
نہ ہٹے اپنے طریقے سے مطیعانِ رسولؐ — گرچہ دنیا کا بہت رنگ بدلتا دیکھا

اثرِ بعثتِ سرکارؐ سے دنیا نے رئیسؔ
رخ بدلتا ہوا تاریخ کا دھارا دیکھ

ملّتِ خورد و نوش

اخلاق آہن
پروفیسر و صدر، شعبۂ فارسی، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی
akhlaque.ahan@gmail.com

شغلِ اقوامِ مسلماں خورد و نوش
ذکرِ اطعم، لحم و نان و آبنوش

ہے گوارش کعبۂ وجدان اب
جہل و بے سمتی ہیں اصطرلابِ ہوش

اشکِ شُسماری سے لکھتا دردِ قوم
روز و شب لیکن وہی ہے جہد و کوش

ہائے اے میراث دارِ نطقِ رب!
تو وجودِ فقدِ روحِ سلف و پوش

خستہ ام از عادت تن پروری
کاش! رہ یابد فغانِ دل بہ گوش

آہنا! گفتی حقیقت تو مگر
ہر طرف دیدی ہجومِ دام، دوش

بابـــ الاستفسار والجواب

ایک روز دوران گفتگو آپ نے بتایا کہ مولانا امین احسن اصلاحیؒ جماعت بنانے کے مخالف تھے اور وہ کسی بھی طرح کی جماعت سازی کو غلط قرار دیتے تھے۔ بات معقول لگی اس لیے کہ میں نے بھی مشاہدہ کیاہے کہ کوئی جماعت خواہ کتنے بھی خلوص سے اٹھے دیر سویر وہ ایک فرقے کا روپ لے ہی لیتی ہے، جبکہ فرقہ بندی سے اسلام نے منع کیا ہے۔ اس کے علاوہ جماعت کی سر گرمیاں دیکھیے تو وہ بھی محض رسم بن کر رہ جاتی ہیں، حتیٰ کہ اس جماعت کے رفقاء یا ارکان کے باہمی تعلقات — جن پر بہت زور دیا جاتا ہے — بھی محض رسمی بن کر رہ جاتے ہیں اور جماعتی ساتھیوں میں باہم حقیقی لگاؤ اور ہمدردی نہیں ہوتی۔ اس لیے بھی جماعت بنانا فضول ہی لگتا ہے۔ لیکن دوسری طرف جماعت سازی کے حامیان کی طرف سے یہ حدیث پیش کی جاتی ہے — لَااِسْلَامَ اِلَّا بِجَمَاعَۃٍ — یعنی جماعت کے بغیر اسلام ہی معتبر نہیں ہے۔ ایسے میں پوچھنا یہ ہے کہ آخر مذکورہ حدیث کا صحیح مفہوم کیا ہے؟ (مسرور احمد، دہلی)

جواب: آپ نے جس "حدیث" کا ذکر کیا ہے وہ نہ کوئی قرآنی آیت ہے اور نہ ہی کوئی حدیث نبویؐ ہے بلکہ حضرت عمرؓ کا قول ہے جو سنن الدارمی میں مذکور ہے (حدیث نمبر ۲۵۷ / باب فی ذھاب العلم)۔ پورا قول یوں ہے:

عن تميم الداري رضي الله عنه، قال: تطاول الناس في البناء في زمن عمر رضي الله عنه فقال عمر: "يا معشر العريب، الأرض، الأرض، إنه لا إسلام إلا بجماعة، ولا جماعة إلا بإمارة، ولا إمارة إلا بطاعة، فمن سوّده قومه على الفقه، كان حياة له ولهم، ومن سوّده قومه على غير فقه، كان هلاكا له ولهم"

(ترجمہ: تمیم الداری سے روایت ہے کہ لوگ عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بڑے بڑے گھر بنانے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے لگے تو انھوں نے فرمایا: اے عرب کے لوگو! زمین سے چپکو۔ جماعت (گروہ) کے بغیر کوئی اسلام نہیں، اور امارت (امیر کے ہونے) کے بغیر کوئی جماعت نہیں اور اطاعت کے بغیر کوئی امارت نہیں۔ جس کسی کو اس کی قوم اس کی سوجھ بوجھ کی وجہ سے امیر (سردار) بنائے گی وہ خود اپنے لئے اور ان کے لئے حیات بخش ہو گا اور جس نا سمجھ کو اس کی قوم امیر بنائے گی وہ اپنے لئے اور ان کے لئے ہلاکت کا باعث ہو گا)۔

سیاق و سباق سے واضح ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ قول حکومت اور سیاسی سرداری

کے بارے میں ہے یعنی کسی بھی مسلم گروہ یا آبادی کو بغیر سیاسی سردار کے نہیں رہنا چاہئے۔ اس کا انطباق وہیں ہو گا جہاں ایسا گروہ یا آبادی آزاد و خود مختار ہو گی لیکن اگر ایسا گروہ یا آبادی کسی ملک کے اندر ہو تو وہاں کا جو بھی سیاسی حاکم (امیر) ہو گا وہی اس گروہ کا بھی حاکم ہو گا۔ یہ بات پرائیویٹ جماعتوں کے لئے نہیں ہے جن کا نہ کسی علاقے پر قبضہ ہے اور نہ ہی اپنے لوگوں کو بچانے اور اپنے علاقے میں امن اور عدل وانصاف قائم کرنے کی کوئی طاقت، جو ایک امیر کے لئے لازمی ہے۔ اس طرح کا بے معنی "امیر" اپنے لوگوں کے لئے صرف مصیبت بنے گا۔ موجودہ زمانے میں پائی جانے والی اسلامی "جماعتوں" پر حضرت عمر کے اس قول کا انطباق نہیں ہوتا ہے۔

پچھلی نصف صدی میں اس طرح کی متعدد "اسلامی جماعتیں" مسلمانوں میں ناسمجھ جوشیلی قیادت کی وجہ سے ابھری ہیں جیسے سعودی عرب کی الجماعۃ السلفیۃ المحتسبۃ (جہیمان العتیبی کی تحریک جس نے محرم ۱۴۰۰ھ / ۲۰ نومبر ۱۹۷۹ میں حرم شریف پر قبضہ کرنے کی کوشش کی تھی)، مصر کی جماعۃ التکفیر والھجرۃ اور تنظیم الجہاد، القاعدہ اور (بزعم خود) دولت اسلامیہ (ISIS) وغیرہ۔ ان کی وجہ سے نہ صرف مشرق وسطی بلکہ پوری دنیا میں اسلام اور مسلمانوں کو بڑا نقصان ہوا اور جو آزادیاں اسلام اور مسلمانوں کو حاصل تھیں وہ حکومتوں نے ختم کر دیں اور ہر اسلامی کام کو شک کی نظر سے دیکھنے لگیں۔ ان نقصاندہ تنظیموں کے ابھرنے سے پہلے اور بعد کے حالات کا میں خود شاہد ہوں۔ ان احمق نوجوانوں نے اسلام کو بڑا نقصان پہنچایا۔ (ظفر الاسلام خان)

یہود اور قرآن مجید

از

مولانا ضیاء الدین اصلاحی

مرتبہ

اشتیاق احمد ظلی

قرآن کریم کے متنوع موضوعات اور تفسیری مضامین کی مختلف فنی جہات کا اس کتاب میں احاطہ کیا گیا ہے۔ ایک بڑا حصہ متن قرآن کی تفسیر و تفہیم سے متعلق ہے۔

قیمت: ۱۵۰/روپے صفحات: ۱۳۸

معارف کی ڈاک

دسمبر کا معارف نظر نواز ہوا۔ صفحہ ۱۴ پر حاشیہ ۱۰ ''دیکھئے معارف خلیق احمد نظامی پر خصوصی اشاعت اپریل ۲۰۰۵ء''۔ جہاں تک میری معلومات ہے معارف کا کوئی بھی ایسا خصوصی اشاعت والا معاملہ نہیں ہے۔

صفحہ ۸۱ پر کلیم صفات صاحب کی بات بہت مناسب ہے کہ ''معارف کے قدیم مقالات وخطوط کے مجموعوں کی باقاعدہ اشاعت کا اہل علم و ادب کی طرف سے تقاضا بھی کیا جارہا ہے''۔ میرے خیال میں علامہ اقبال، مولانا آزادو غیرہ پر مقالات کے مجموعے مرتب ہوسکتے ہیں۔ اسی طرح سے مشاہیر کے خطوط (بنام سید سلیمان ندوی) کی اور جلدیں بعد کے مدیروں کے نام اور شذرات سلیمانی کے طرز پر مزید شذرات کی جلدیں آسکتی ہیں۔امید ہے کہ مندرجہ بالا گذارشات پر غور کریں گے۔ (شاہ ظفر الیقین، اعظم گڑھ)

جواب: مقالہ نگار نے جو حوالہ دیا ہے پہلے تو ان ہی سے یہ پوچھنا چاہئے کہ یہ آپ نے کہاں سے دیا ہے؟ بلکہ اگر ممکن ہو تو اس خاص اشاعت کا عکس منگوالینا چاہئے۔ اپریل ۲۰۰۵ء کے معارف میں اس قسم کا یااس موضوع پر کوئی مضمون شائع ہی نہیں ہوا ہے کجا کہ معارف کے ''یادگار نظامی'' خصوصی نمبر کی بات تحریر کی جائے، جب خلیق صاحب کا انتقال ہوا تو اس وقت مولانا ضیاء الدین اصلاحی مدیر تھے، انہوں نے ان پر خود وفیات لکھنے کے بجائے بعض ایسے اہل علم سے ان پر مضمون لکھنے کی فرمائش کی تھی جن کو نظامی صاحب سے گہری واقفیت ہو، چنانچہ پروفیسر اصغر عباس صاحب علی گڑھ نے ''پروفیسر خلیق احمد نظامی کی یاد میں'' کے عنوان سے ایک مقالہ لکھا جو مولانا نے مختصر نوٹ کے ساتھ معارف جنوری ۱۹۹۸ء میں شائع کیا۔ اس مضمون میں دارالمصنّفین اور معارف سے ان کی نسبت کا ذکر بھی اصغر صاحب نے نہیں کیا ہے۔

معارف نے اب تک درج ذیل خصوصی نمبر شائع کیے ہیں:

۱۔ معارف کا سید سلیمان نمبر (مئی، جون ۱۹۵۵ء)

۲۔ دسمبر ۱۹۵۰ء کا معارف مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی کے لیے خاص تھا(اس کے بعد سید صباح الدین عبدالرحمن اور مولانا ضیاء الدین اصلاحی کے عہد ادارت میں معارف کا کوئی خاص نمبر نہیں نکلا)۔ اس کے بعد پروفیسر اشتیاق احمد ظلی نے معارف کے دو خصوصی نمبر نکالے۔

۳۔ معارف کا شبلی نمبر (نومبر، دسمبر ۲۰۱۴ء)(یہ شبلی صدی کے خاص موقع پر نکالا گیا تھا)

۴۔ معارف خصوصی اشاعت دو حصوں میں (ہندوستانی مسلمان شذرات معارف کے آئینہ میں)(جون، جولائی ۲۰۱۶ء)(یہ معارف صدی تقریبات کی مناسبت سے شائع کیا گیا تھا)۔ مذکورہ بالا ''یادگار نظامی'' خصوصی اشاعت کا معارف اعظم گڑھ سے کوئی تعلق نہیں ہے (مضمون نگار نے تسلیم کیا ہے کہ ان سے سہو ہو گیا ہے)۔ (کلیم صفات اصلاحی)

رسید کتب موصولہ

مولانا ابو القاسم محمد عتیق فرنگی محلیؒ، آسان ترجمہ قرآن عظیم: علامہ عبد الحی فرنگی محلی فقہ اکیڈمی، اسلامک سنٹر آف انڈیا، فرنگی محل، لکھنؤ، صفحات: ۷۲۸، سال اشاعت: ۲۰۲۲ء، قیمت: ۱۰۰۰ روپے، ای میل: imamkrasheed@gmail.com

ڈاکٹر وسیم احمد فراہی، ڈاکٹر عبد الرازق الحافظ، اختر مسلمی: شخصیت اور فن: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ نگر، نئی دہلی، صفحات: ۳۶۰، سال اشاعت: ۲۰۲۵ء، قیمت: ۶۰۰ روپے، موبائل نمبر: درج نہیں

اظہر سلیم، اظہر من الشمس (غزلوں کا مجموعہ): دانش محل، لکھنؤ، صفحات: ۲۴۰، سالِ اشاعت: ۲۰۲۳ء، قیمت: ۲۵۰ روپے، موبائل نمبر: ۹۰۴۴۱۲۳۱۴۷

محمد عرفان جون پوری، شاعری میں شہر جون پور: عزیزیہ لائبریری، محلہ میر مست، جون پور (یوپی)، صفحات: ۲۱۶، سال اشاعت: ۲۰۲۵ء، قیمت: ۲۷۵ روپے، موبائل نمبر: ۹۸۸۹۱۲۴۰۵۶

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، عرشی تاج پوری: احوال و آثار: شائستہ منزل، غلامی کا پورا (عقب آواس وکاس کالونی)، ضلع اعظم گڑھ، صفحات: ۱۲۸، سال اشاعت: ۲۰۲۵ء، قیمت: ۲۰۰ روپے، موبائل نمبر: ۹۸۳۸۵۷۳۶۴۵

ڈاکٹر عرفات ظفر، قرآن کریم کے اعجازی پہلو: ادارہ علوم القرآن، شبلی باغ، علی گڑھ، صفحات: ۴۰۷، سال اشاعت: ۲۰۲۵ء، قیمت: ۵۰۰ روپے، موبائل نمبر: ۹۹۷۱۴۷۷۶۶۴

سالم برجیس ندوی، کرپٹو کرنسی: حقیقت، ماہیت اور احکام: ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی، نبی نگر، دوہرّا، علی گڑھ، صفحات: ۱۴۴، سال اشاعت: ۲۰۲۵ء، قیمت: ۱۵۰ روپے، ای میل: idaratahqeeq2016@gmail.com

خورشید احمد اعظمی ندوی مدنی، مغنی المحتاج الی شرح مقدمۃ مسلم بن الحجاجؒ: مکتبہ احسان، لکھنؤ، صفحات: ۳۰۸، سال اشاعت: درج نہیں، قیمت: درج نہیں، موبائل نمبر: ۹۷۹۳۱۱۸۲۳۴

عرفان احمد صباحی، مولانا سلطان احمد اصلاحی حیات اور علمی و فکری جہات (مجموعۂ مقالات): مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ، صفحات: ۴۰۰، سال اشاعت: ۲۰۲۵ء، قیمت: ۵۰۰ روپے، موبائل نمبر: ۹۴۱۲۶۷۱۸۸۱

سہیل انجم، نقش بر آب (شخصی خاکوں کا مجموعہ): پاریکھ بک ڈپو، لکھنؤ، صفحات: ۲۰۸، سال اشاعت: ۲۰۲۳ء، قیمت: ۳۰۰ روپے، موبائل نمبر: ۹۳۸۹۴۵۶۷۸۶

تصانیف سید صباح الدین عبدالرحمٰنؒ

اسمائے کتب	قیمت	اسمائے کتب	قیمت
حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ	20/-	ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں	60/-
حضرت ابوالحسن ہجویری	20/-	ظہیرالدین محمد بابر (ہندومورخین کی نظر میں)	300/-
مولانا شبلی نعمانی پر ایک نظر	70/-	ہندوستان کے بزم رفتہ کی سچی کہانیاں (اول)	150/-
محمد علی کی یاد میں	250/-	ہندوستان کے بزم رفتہ کی سچی کہانیاں (دوم)	100/-
بزم رفتگاں اول	240/-	ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان	
بزم رفتگاں دوم	250/-	حکمرانوں کی مذہبی رواداری (اول)	75/-
صوفی امیر خسرو	150/-	ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان	
اسلام میں مذہبی رواداری	250/-	حکمرانوں کی مذہبی رواداری (دوم)	100/-
بزم تیموریہ اول	400/-	ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان	
بزم تیموریہ دوم	220/-	حکمرانوں کی مذہبی رواداری (سوم)	150/-
بزم تیموریہ سوم	260/-	مغل بادشاہوں کے عہد میں ہندوستان	
بزم صوفیہ	350/-	سے محبت وشیفتگی کے جذبات	150/-
ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی ایک ایک جھلک	240/-	مقالات سلیمان (اول)	400/-
ہندوستان کے عہد وسطیٰ کا فوجی نظام	425/-	غالب مدح وقدح کی روشنی میں (اول)	350/-
ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے تمدنی جلوے	250/-	غالب مدح وقدح کی روشنی میں (دوم)	150/-
بزم مملوکیہ	250/-	سید سلیمان ندوی کی دینی وعلمی خدمات پر ایک نظر	60/-
ہندوستان کے سلاطین علما اور مشائخ پر ایک نظر	250/-	مولانا سید سلیمان ندوی کی تصانیف کا مطالعہ	150/-
ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے		عالم گیر (انگریزی)	100/-
تمدنی کارنامے	200/-	صلیبی جنگ	25/-

Total Pages: 84 (Including Cover Page)

JAN 2026 Vol- 213(1) ISSN 0974-7346 Ma'arif(Urdu)-Print

RNI. 13667/57 MA'ARIF **AZM/NP- 43/2026-28**

Monthly Journal of

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY

P.O.Box No: 19, Shibli Road, AZAMGARH, 276001 U.P. (INDIA)

Email: info@shibliacademy.org

دارالمصنّفین کی نئی مطبوعات

روایاتِ سیرت نبویؐ (بلاذری کے حوالے سے)	مولانا کلیم صفات اصلاحی	450/-
مصادرِ سیرت نبویؐ (مجموعۂ مقالات سیمینار)	مرتبہ: مولانا کلیم صفات اصلاحی	600/-
عہد اسلامی کا ہندوستان: معاشرت، معیشت اور حکومت کے مسائل	پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی	300/-
وفیات مشاہیر (مولانا ضیاء الدین اصلاحی)	ڈاکٹر ظفر الاسلام خاں وسلیم جاوید	600/-
دارالمصنّفین کے سو سال (اضافہ شدہ)	مولانا کلیم صفات اصلاحی	500/-

تاریخ ساز ادارے کے معاون خاص بنئے

برصغیر کے قدیم ترین علمی اور تحقیقی ادارہ دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ کو خود کفیل بنائیے۔ سنہ ۱۹۱۴ سے قائم یہ وہی ادارہ ہے جس نے علامہ شبلی نعمانی کی شہرہ آفاق تصنیف سیرت النبی سمیت ۲۸۰ بیش قیمت علمی اور تحقیقی کتابیں شائع کی ہیں۔ آج جبکہ تاریخ کے نام پر مسلمانان ہند پر یلغار ہو رہی ہے، اس ادارے کو تقویت دینا اور خود کفیل بنانا پوری ملت کا فرض ہے۔ کم از کم پانچ ہزار روپیے سالانہ تعاون فرمائیں۔ اکاؤنٹ کی تفصیل اور QR کوڈ حاضر ہے۔

A/C: DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH
A/C No: 0504010100032752
Bank Name: PUNJAB NATIONAL BANK
Branch: HEERPATTI - AZAMGARH (U.P.)
IFSC: PUNB 0476100 - Bank Code: 476100

Darul Musannefin Shibli Academy
Shibli Road, Azamgarh-276001, U.P.
Contact: Dr Fakhrul Islam Azmi, Dy. Director
Mobile: 99352 33940
Email: info@shibliacademy.org [to inform after remittance]
www.shibliacademy.org

7309301663m1@pnb
Scan and pay with any BHIM UPI
BHIM UPI
G Pay PhonePe Paytm

تعاون بھیج کر اپنے پورے پتہ کے ساتھ ہمیں ای-میل سے مطلع کریں۔ ڈاکٹر ظفر الاسلام خان (ڈائرکٹر)